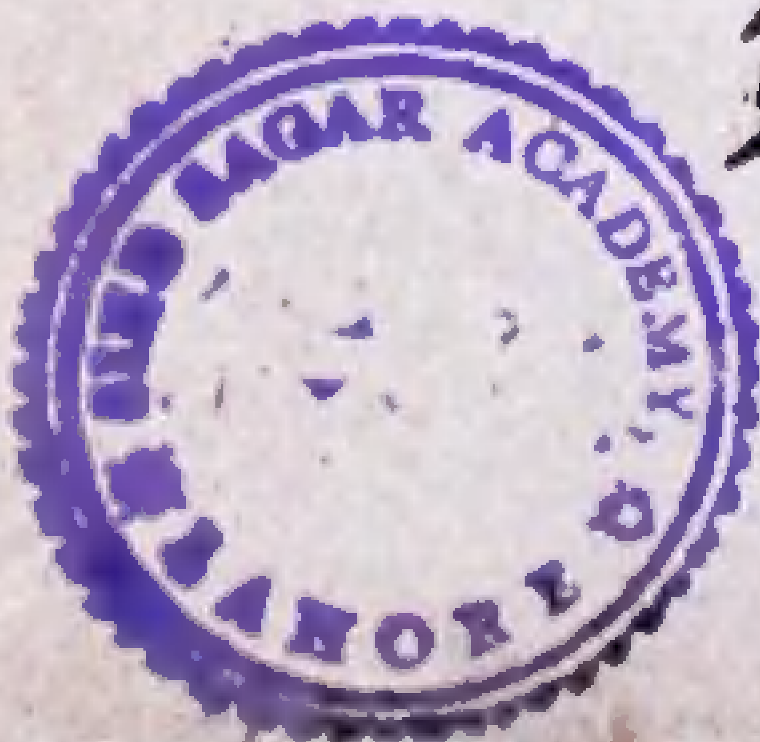
اشتراکی عالمِ ربانی

مولانا عبدالرحیم پوپلزئیؒ

عمر فاروق خاں

سندھ ساگر اکادمی لاہور
چوک مینار - انارکلی



باراوّل جنوری ۱۹۷۰ء

• مطبع ثنائی برقی پریس لاہور

• طابع محمد مسعود۔ سندھ ساگر اکادمی لاہور

• قیمت ۱ء۵۰

پیش لفظ

عمر فاروق خاں صاحب کا نام تو مَیں پہلے ہی سُن چکا تھا لیکن ان سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۱ء کے اواخر میں ہوئی۔ صوبہ سرحد میں انتخابات ہو رہے تھے۔ عبدالقیوم خاں وہاں کے وزیر اعلیٰ تھے۔ لاہور سے چند اخبار نویس صوبہ سرحد کی انتخابی سرگرمیاں دیکھنے کے لیے مدعو کیے گئے۔ ان میں ایک میں بھی تھا۔ ہم لوگ پیر صاحب مانکی شریف مرحوم کے ساتھ ضلع مردان کے مختلف پولنگ سٹیشن دیکھتے ہوئے صوابی کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں ہمیں ایک پولنگ سٹیشن پر عمر فاروق صاحب ملے۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے پیر صاحب مرحوم و مغفور کو بتایا کہ ہمارے امیدوار کے جیتنے کا کوئی امکان نہیں۔ کیونکہ مخالف امیدوار کا بیلٹ بکس وقفہ کے دوران ووٹوں سے بھر دیا گیا ہے۔

عمر فاروق صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد کئی بار لاہور میں ان سے میں ملا۔ لیکن یہ سب ملاقاتیں بس سرسری سی تھیں۔

۱۹۵۹ء میں روزنامہ بانگِ حرم کی ادارت کے سلسلے میں مجھے پشاور جانا پڑا۔ اور وہاں میں ۱۹۶۳ء تک رہا۔ عمر فاروق صاحب اپنے گاؤں سے اکثر پشاور آتے رہتے تھے، اور بالعموم میرے پاس ہی ٹھہرتے تھے۔ اب میری

ان سے طویل ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ان سے سیاسی بھی باتیں ہوتیں، اور دینی و علمی بھی۔ "حضرت شاہ ولی اللہ رح" ان کا اور میرا مشترک موضوع تھا۔ اور چونکہ ان کا طویل سیاسی تجربہ تھا۔ اور وہ متعدد انقلابی تنظیموں میں کام کر چکے تھے اس لیے تحریک ولی اللہی کی تشریح و تعبیر اور انداز سے کرتے تھے، جو میرے لیے معلومات بھی ہوتی اور بصیرت افروز بھی۔ اور میں پہروں بڑے انہماک سے ان کی باتیں سنتا رہتا۔ عمر فاروق صاحب دور حاضر میں مولانا عبدالرحیم پوپلزئی صاحب کو تحریک ولی اللہی کا صحیح شارح و نمائندہ مانتے تھے۔ لیکن اس سلسلے میں میرا علمی رابطہ مولانا عبیداللہ سندھی صاحب سے تھا اور میں نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے متعلق جو کچھ بھی پڑھا، مولانا سندھی سے پڑھا تھا۔ بے شک ان دونوں بزرگوں میں بہت سی باتوں میں اتفاق تھا۔ دونوں عقیدۂ وحدت الوجود اور وحدت ادیان کو اساس مان کر برعظیم پاک و ہند کی جملہ اقوام کو کسی نہ کسی مرکزی نقطے کے تحت مجتمع کرنے کے حق میں تھے، لیکن جہاں مولانا سندھی آل انڈیا کانگریس کے وجود کو مان کر اس کی ہیئت کو بدلنا چاہتے تھے، وہاں مولانا عبدالرحیم پوپلزئی اس امر کے داعی تھے کہ کانگریس سے کلی طور پر قطع نظر کر کے ہمیں براہ راست کسانوں اور مزدوروں کو منظم کرنا چاہیے۔ کیونکہ ان کے نزدیک کانگریس کا سرمایہ دارانہ اور برجوازی خطوط پر ہونا لازمی ہے۔ مختصراً اس معاملے میں مولانا سندھی کا نقطۂ نظر بنیادی طور پر "قومی" تھا اور مولانا پوپلزئی کا "طبقاتی"۔ عمر فاروق صاحب اس مسئلے پر خوب بحثیں کرتے، اور مولانا پوپلزئی کی دور بینی اور واقعیت پسندی کے ثبوت میں تقسیم برعظیم سے قبل اور بعد کے واقعات پیش کرتے

اور بتاتے کہ کانگریس کی تعمیر ہی میں خرابی کی یہ صورت مضمر تھی اور اس میں حالات گردوپیش کا زیادہ دخل نہیں سمجھنا چاہیے۔

عمر فاروق صاحب ضلع ہزارہ کی مانسہرہ تحصیل کے ایک دور افتادہ گاؤں میں رہتے تھے، جہاں اخبار بھی مشکل سے پہنچ پاتے ہیں۔ لیکن ریڈیو کی بدولت وہ اس گوشۂ عزلت میں بھی دنیا کے ہر حصے میں ہونے والے نئے سے نئے واقعات سے پورے باخبر رہتے تھے۔ خاص طور پر عوامی جمہوریہ چین اور سوویٹ یونین کی نظریاتی کش مکش سے جو اس وقت شروع ہو چکی تھی، وہ پوری طرح آگاہ تھے۔ اور اس کی روشنی میں تاریخ اسلام کے بعض عقدے جو سمجھ میں نہیں آتے، حل کرتے تھے۔ اور اسلامی فکر اور اسلامی تاریخ کی مدد سے اس صدی کے اشتراکی انقلابات کا جائزہ لیتے، اور ان اشتراکی انقلابات کی مدد سے اسلامی فکر اور اسلامی تاریخ کی گتھیاں سلجھاتے۔

عمر فاروق صاحب سیاسیات اور اقتصادیات پر گفتگو کرتے تو میں محسوس کرتا کہ ایک پکا مارکسسٹ بول رہا ہے۔ اور جب ذکر و فکر کی باتیں ہونے لگتیں تو مجھے اپنے سامنے ایک صوفی صافی بزرگ بیٹھے نظر آتے۔ وہ مارکس، لینن، سٹالن، اور ماؤزی تنگ کے حوالے دیتے۔ لیکن جب حضرت مولانا لاہوری کا کوئی ارشاد نقل کرتے یا ان کی زندگی کا کوئی اثر انگیز واقعہ بیان ہوتا تو پرانے وقتوں کے مرید و مرشد کے تعلق کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا۔ اس زمانے میں ہم مسلسل کئی دن تک ساتھ رہے۔ اس دوران میں جب بھی نماز کا وقت آتا تو وہ بڑی باقاعدگی سے فریضۂ نماز ادا کرتے۔ وہ

کتنے مارکسسٹ تھے اور کتنے پولیٹی ٹسٹ، میں اب تک فیصلہ نہیں کر سکا۔

اس کتاب کا مسودہ ۱۹۶۱ء سے میرے پاس تھا۔ حالات کچھ ایسے ر
کہ اس کے چھپنے کی نوبت نہ آسکی۔ اب اپنے محترم دوست کے ارشاد کی تعمی
کرتے ہوئے یہ سطریں لکھ رہا ہوں، اس توقع کے ساتھ کہ اب اس مسودہ کے شا
ہونے میں مزید دیر نہیں ہوگی۔

محمد سرور

فہرس

خاندانی حالات

مفتیِ سرحد مولانا عبدالرحیمؒ پوپلزئی پشاور کے مشہور علمی خاندان پوپلزئی کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے والد بزرگوار مولانا عبدالحکیم اور جدِامجد مولانا محمد امین کا اپنے زمانے کے بلند مرتبہ علما میں شمار ہوتا تھا۔ پوپلزئی خاندان پوپل خاں کی طرف منسوب ہے، جو مولانا عبدالرحیم کے بزرگوں میں سے ایک مشہور شخصیت تھے۔ پوپل خاں کا شجرۂ نسب احمد شاہ ابدالی سے ملتا ہے۔ پشاور کے فرمانروا امیر محمد عظیم خاں کے عہدِ حکومت میں مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کے جدِامجد مولانا محمد امین کے والد بزرگوار مولانا عبدالرحیم عہدۂ قضا پر فائز تھے۔ پشاور پر سکھوں کے قبضے کے بعد مولانا موصوف نے عہدۂ قضا ترک کر کے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ چونکہ آپ کی حکومت لوگوں کے دلوں پر تھی، اس لیے دنیوی اقتدار ختم ہونے کے بعد بھی لوگوں میں آپ کا اثر و رسوخ پہلے کی طرح قائم رہا، اور پوپلزئی خاندان کی عزت و احترام میں کوئی فرق نہ آیا۔

مولانا عبدالرحیم ۱۸۹۰ء میں پشاور میں پیدا ہوئے، اس وقت ہندوستان کی ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی ناکام ہو چکی تھی۔ انگریزوں کا برِعظیم پاک و ہند پر پوری طرح تسلط ہو چکا تھا، اور وہ پوری بربریت سے اس ملک پر حکمرانی کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ آپ کی وفات ۲۱ مئی ۱۹۴۴ء کو ہوئی اور یہ وہ وقت تھا جب کہ

دوسری جنگِ عظیم میں فسطائی طاقتیں شکست کھا رہی تھیں اور ہندوستان کے افق پر آزادی کا مہتاب طلوع ہونے والا تھا۔

مولانا مرحوم کے جد امجد کے والد مولانا عبدالرحیم صاحب امیر محمد عظیم خان پشاور کے قاضی تھے۔ ان کی شکست کے بعد انھوں نے پشاور ہی میں قیام کرنا پسند فرمایا، اور دینی علوم کا درس دینا شروع کر دیا۔ وہ اپنے زمانہ میں چوٹی کے عالم شمار ہوتے تھے۔ یہ امتیازی شان ان کے صاحبزادے مولانا محمد امین صاحب اور پھر ان کے پوتے مولانا عبدالحکیمؒ کے زمانہ تک بدستور قائم رہی۔ مولانا عبدالحکیم صاحب نے اپنا علمی ورثہ اپنے فرزند مولانا عبدالرحیم صاحب کے سپرد کیا۔ مولانا عبدالرحیم صاحب پوپلزئی نے ۱۹۰۸ء تک تمام متداول کتب اپنے والد ماجد مولانا عبدالحکیم صاحب سے پڑھیں۔ مولانا عبدالحکیم صاحب ایک درویش صفت زاہد اور پارسا شخص تھے۔ یہ اثر مولانا عبدالرحیم مرحوم پر آخر تک رہا۔ مولانا عبدالحکیم ایک بلند پایہ خطیب بھی تھے۔ اس طرح مولانا عبدالرحیم کو فن خطابت بھی ورثہ میں ملا۔ مولانا نے اپنے طالب علمی کے زمانہ ہی میں اپنے سے کم درجہ کے طلبہ کو بعض کتابیں پڑھانا شروع کر دی تھیں۔ ۱۹۰۸ء میں مولانا اپنے والد کی اجازت سے تکمیل علوم کی خاطر ہندوستان گئے۔ اس سلسلے میں وہ رامپور، دہلی، مینڈو، اور آخر میں دارالعلوم دیوبند میں رہے۔ مولانا کو اپنے قیامِ دیوبند میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کی صحبت خاص میں رہنے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ نے ان ہی سے سند حدیث حاصل کی۔ اور حضرت شیخ کے فیض صحبت سے وہ تحریک ولی اللہی سے وابستہ ہو گئے۔ حضرت شیخ نے مولانا مرحوم کو اپنی صحبت خاص میں تربیت دی اور سرحد و ماورائے سرحد

کے ان حضرات سے واقف کرایا جو تحریک کے وابستگان میں سے تھے۔

مولانا فرماتے تھے کہ مجھے حضرت شیخ نے انسانی عظمت سے آشنا کیا، محض رسمی علوم پر قناعت نہ کرنے کا سبق دیا اور تفکر اور تدبر کی دعوت دی۔ راقم الحروف نے ایک دن مولانا مرحوم سے سوال کیا کہ حضرت! کیا وجہ ہے کہ سب علماء ہی کتابیں پڑھتے ہیں اور ایک ہی استاذ سے پڑھتے ہیں پھر علم اور عمل میں کیسے فرق پڑ جاتا ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ علم کے مدارج میں فضیلت صرف صحبت شیخ کو ہے جسے جتنی اور جیسی صحبت میسر آگئی، وہ اپنا اثر کر گئی۔

مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کو حضرت شیخ کی صحبت خاص سے مشرف ہونے سے پہلے تحصیل علوم کے دوران میرے استاذ مکرم مولانا محمود احمد صاحب ملک پوری نے دیوبند میں دیکھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ مولانا بڑی شان سے دیوبند میں رہا کرتے تھے۔ بعد میں جب ان دونوں حضرات کی ملاقات میرے گاؤں ملک پور میں ہوئی تو مولانا محمود احمد صاحب مولانا عبدالرحیم کو نہ پہچان سکے۔ کچھ بے تکلفی کے بعد مولانا محمود احمد صاحب نے مولانا مرحوم سے تغیر حالت کے بارے میں سوال کیا تو مولانا نے فرمایا کہ حضرت شیخ نے ایسا کر دیا۔ اور بے ساختہ غالب کا یہ شعر پڑھا:

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اب مولانا عبدالرحیم میں نہ تو خوش لباسی کا شوق تھا۔ نہ دنیاوی جاہ کی طلب تھی۔ ان پر خود فراموشی کی سی حالت طاری رہتی تھی۔ وہ سادا کھدر کا لباس پہنتے تھے، اور سر پر سفید کھدر کی ٹوپی ہوتی تھی۔ گرم موسم میں آپ کا یہ لباس ہوتا تھا۔ سردی

میں ایک گرم واسکٹ اور ایک ہلکا سا خوبصورت کمبل۔ یہ لباس آخری ایام تک قائم رہا۔ بے نیازی، قلندری اور توکل علی اللہ مولانا کی امتیازی شان تھی۔ وہ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب معاش
آنچہ ما در کار داریم اکثرش در کار نیست

ایک دن میں نے مولانا سے ان کی پسند کے اشعار کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے فرمایا مجھے سودا کی یہ رباعی بہت پسند ہے:

سودا قمارِ عشق میں خسرو سے کوہکن
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو دے سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

اس رباعی کے پڑھنے کے بعد مولانا کی حالت کچھ اور ہو گئی۔ ایک دفعہ میں نے سوال کیا کہ حضرت شیخ الہند کو کون سا شعر پسند تھا۔ فرمایا کہ وہ اکثر یہ رباعی پڑھا کرتے تھے:

غرہ مشو کہ مرکب مردان راہ را
در سنگلاخ بادیہ پیہم بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ مستانِ بادہ نوش
دریک خروش تا در جانان رسیدہ اند

مولانا مرحوم ۱۹۱۲ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ اس کے بعد حسب الحکم

حضرت شیخ الہند آپ نے پشاور میں درس دینا شروع کیا۔ ابتدائی طور پر یہ تعلیمی سلسلہ باقاعدہ ۱۹۱۶ء میں شروع ہوا۔ آپ کا خاندان علمی لحاظ سے چونکہ بہت مشہور تھا، اس لیے دور دراز سے طلبہ آنے شروع ہو گئے۔ مسجد قاسم علی خان، جہاں مولانا مدفون ہیں، کے حجرہ میں درس شروع ہوا۔ بعض ذہین طلبہ کو مولانا اپنے گھر پر بھی پڑھاتے۔ آپ کے شاگردوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے۔ افغانستان، قبائلی علاقہ، بغداد اور ترکی تک کے بعض اہل علم کو مولانا سے شرفِ شاگردی حاصل ہے۔

مولانا عبدالرحیم صاحب سادہ مزاج اور جفاکش انسان تھے۔ وہ جسمانی طور پر گو کمزور تھے مگر سینے میں ایک قوی دل رکھتے تھے۔ ایک دفعہ اگر کسی کام کو کرنے کا فیصلہ کر لیتے تو ساری قوت اس کی تکمیل میں لگا دیتے۔ آپ بڑے خوش بیان تھے اور لہجے میں بڑی شیرینی تھی۔ اور گفتگو میں ایک تسلسل ہوتا تھا۔ مولانا ایک گوشہ نشین صوفی نہ تھے۔ باوجود ایک اعلیٰ سالک ہونے کے وہ ایک سیاسی رہنما تھے۔ ایک بے بدل خطیب، ایک بہادر سپاہی، ایک نڈر محب وطن اور ایک فلاسفر بھی۔ نیز وہ ایک باریک بیں فقیہہ اور مولوی تھے۔ آپ اکثر دن بھر کسانوں اور دبی ہوئی مظلوم آبادی میں عملی سیاسی کام کرتے، اور آدھی رات اٹھ کر اپنے مولانا کے حضور میں حاضری دیتے۔ وہ شب بیدار اور عبادت گزار بزرگ تھے۔ کاغان اور ہنجول کی سخت سرد وادیوں میں دن کو بیس بیس میل چل کر، جلسے کر کے اور لوگوں کو سمجھا کر رات کو اٹھتے تھے اور اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ صبح کی نماز اکثر باجماعت ہوتی تھی۔ اور اس کی پہلی رکعت میں بالعموم سورۂ قیامہ

پڑھا کرتے تھے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، مولانا کو شیخ الہند کی خاص صحبت سے بہرہ مند ہونے کا موقع ملا تھا۔ آپ فرماتے تھے کہ حضرت شیخ نے ابتدا میں مجھے تفکر فی الملکوت السموات والارض کی دعوت دی۔ مجھے بتایا گیا کہ انسان اس کائنات ارضی و سماوی کا فعال جزو ہے۔ یہ متحرک ہے اور اس کی ہر حرکت دوسرے کی حرکت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس لیے نجات یا فلاح منفرد نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ اور اجتماعی فلاح اجتماعی عمل صالح سے ہی ممکن ہے۔ آپ نے حضرت شیخ کے اس ارشادِ عالی کو اپنی زندگی کے آخری لمحات تک حرزِ جاں بنایا۔ مولانا چونکہ ایک تخلیقی ذہن کے مالک تھے اس لیے اپنے فہم اور تجربے کی روشنی میں اس کے مفہوم کو اور بھی وسیع کیا۔ ۱۹۱۴ء سے وہ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تحریک ولی اللہی سے بھی وابستہ رہے۔ ان کا ہمیشہ ان حضرات سے تعلق رہا جو سامراج کے مقبوضہ علاقوں سے باہر تھے۔ مولانا نے ایک دفعہ فرمایا کہ مجھ میں تین قوتیں ہیں جو مجھے سامراج کے خلاف برسرِ پیکار رکھ رہی ہیں۔ میں نے دینی علوم کا اکتساب مولانا محمود حسن سے کیا ہے اور ان کی سامراج دشمنی سب پر روشن ہے۔ وہ اپنے زمانے کی سامراج دشمن تحریک کا مرکز تھے۔ اور آزادیٔ ہند کی جدوجہد میں ان کا منفرد مقام تھا۔ اپنے اس سلسلہ میں وہ ولی اللہی تحریک کے قائد تھے۔ (۲) میں نے فلسفہ اور علوم عقلیہ کا اکتساب مولانا فضل حق خیر آبادی کے ایک شاگرد سے کیا۔ اور حصول فلسفہ کا میرا دوسرا سلسلہ مولانا غلام رسول صاحب بگوی سے ملتا ہے۔ یہ دونوں سلسلے آگے چل کر تحریک ولی اللہی کے مرکز سے مل جاتے

ہیں۔(۳) میں روحانی سلسلہ میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ ساتھ حضرت بڑے صاحب سے وابستہ ہوں جو سامراج دشمنی میں افغانی علاقہ میں اپنی نظیر آپ تھے۔

مولانا نے مجھ سے ایک دفعہ فرمایا کہ اکثر جب سخت مقامات میں میں نے اپنے آپ کو مشوش پایا تو حضرت بڑے صاحب کے فیوض نے میری رہنمائی کر کے مجھے استقامت بخشی، جو رویائے صالحہ کی شکل میں ہوتی تھی۔ اس جد وجہد میں میری استقامت ان ہی کی بدولت ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد جب خلافت اور برطانی حکومت سے عدم تعاون کی عوامی تحریکیں شروع ہوئیں اور مسلمانوں اور ہندوؤں نے مل کر اجنبی حکومت کے خلاف جدوجہد شروع کی تو مولانا عبد الرحیم پوپلزئی صاحب اپنے استاد حضرت شیخ الہند کے نقش قدم پہ ان تحریکوں میں شریک ہو گئے۔ اور اس محاذ پر ایک ممتاز حیثیت حاصل کی، لیکن جلد ہی یہ محسوس کر لیا کہ یہ راہ منزل تک نہیں لے جا سکے گی۔



سیاسی سرگرمیاں

پہلی جنگِ عظیم کے ختم ہوتے ہی برِعظیم پاک و ہند میں برطانی سامراج کے خلاف عوام کے جذبات بھڑک اٹھے۔ اجنبی حکومت نے رولٹ ایکٹ نافذ کر کے جب عوام کو دبانے کی کوشش کی تو ملک میں مظاہرے شروع ہو گئے۔ اس سلسلے میں ایک بڑا مظاہرہ امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں ہوا، جہاں انگریز جنرل ڈائر کے حکم سے نہتے عوام پر گولیوں کی بوچھاڑ کی گئی، اور اس کی وجہ سے بہت سے لوگ مارے گئے۔ جلیانوالہ باغ کے اس ہولناک واقعہ نے پورے برِعظیم میں آگ لگا دی، اور عوام برطانی سامراج کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

اسی دوران میں خلافت کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ فاتح اتحادی طاقتوں نے جن میں پیش پیش برطانیہ تھا، عثمانی خلافت کے دارالخلافت استنبول پر قبضہ کر لیا اور عثمانی خلیفہ کو اپنا تابع بنا لیا۔ مکہ و مدینہ پر برطانیہ کے نامزد شریف حسین کا قبضہ ہو گیا، اور اس طرح خلافت اور مقاماتِ مقدسہ کی آزادی ختم ہو گئی۔

یہی وہ زمانہ ہے جب امان اللہ خاں افغانستان میں برسرِ اقتدار آئے اور انھوں نے اپنے ملک کو برطانوی قیود سے آزاد کرانے کے لیے برطانیہ سے جنگ کی اور آخر میں افغانستان صحیح معنوں میں آزاد ہو گیا۔

۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کے اس پُر اضطراب اور انقلاب انگیز دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے مل کر برطانی حکومت کے خلاف جدوجہد شروع کی جس کے پیشِ نظر ایک طرف ہندوستان کی آزادی اور دوسری طرف خلافت اسلامیہ کی بحالی تھی۔ اس سلسلے میں ہزارہا ہزار ہندو مسلمان جیلوں میں گئے اور کانگرس اور خلافت تحریک دونوں مل کر سرگرم کار رہیں۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ سوامی شردھانند، جس نے بعد میں شدھی تحریک شروع کی تھی، دہلی کی جامع مسجد میں گیا، اور وہاں تقریر کی۔ اسی طرح مسلمان زعما ہندوؤں کے اجتماعوں میں جاتے تھے۔

برطانی سامراج کے خلاف ہندوؤں اور مسلمانوں کا یہ متحدہ اقدام دیرپا ثابت نہ ہوا۔ پھر اُن میں پھوٹ پڑ گئی اور دونوں میں بلوے ہونے لگے۔ مولانا عبدالرحیم نے اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس تحریک میں حصہ لیا۔ تحریک خلافت کی ناکامی اور ہندو مسلم فسادات نے مولانا کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی اس طرح کی متحدہ تحریکات پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور کیا۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ایک سرمایہ دار قیادت میں ہندوستانی قومیت کا ترقی کرنا محال ہے۔ پھر جب کہ وہ قیادت خود فرقہ دارانہ تنگ نظری کا شکار ہو۔ چنانچہ مولانا فرماتے تھے کہ اب مجھے ہندوستانی عوام کے اتحاد کے لیے کام کرنا ہے کیونکہ ان کے اندر اتحادِ مقصد موجود ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا اپنے شیوخ کی رکھی ہوئی بنیاد یعنی نظریۂ وحدت الوجود پر، جسے انھوں نے اپنے تجربہ اور وجدان سے اور بھی وسیع تر مفہوم میں ترقی دی تھی، کام کرنا چاہتے

تھے۔ اور اس نظریہ کو انھوں نے عالمگیر اخوت کی اساس کے طور پر پیش کیا، اور محنت کش عوام کو منظم کرنا شروع کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خیالات عکس ہوتے ہیں ان مظاہر کا جو خارج میں موجود ہوتے ہیں اور یہی خارجی حالات ایک فعّال حیثیت سے اپنے ماحول کو متاثر کرتے ہیں۔ حضرت مولانا کو اپنی اس فکر میں اور ساتھی بھی مل گئے۔ اور وہ بھی اسی طرح سوچنے لگے جیسے مولانا سوچتے تھے۔ اور اس سوچ اور طرزِ فکر کو عام کرنے کے لیے انھوں نے "سرفروش" نام کا اخبار پشاور سے نکالا یہ ۱۹۲۷ء کا واقعہ ہے۔ مولانا نے اس اخبار کی سرپرستی فرمائی۔ اس اخبار پر سامراج اور اس کے ایجنٹوں کا یہ حملہ کہ یہ لادینیت کا پرچارک ہے، مولانا کی مسلّمہ مذہبی عظمت کی وجہ سے ناکام رہا۔ حالانکہ سامراج نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے اس مہم کو پوری قوت سے چلایا۔ اس وقت کے مفادِ خصوصی رکھنے والے پریس کا مواد میرے اس قول کا شاہد ہے۔ "سرفروش" کے ذریعے صوبہ سرحد میں "نوجوان بھارت سبھا" کی بنیاد ڈالنے اور اس کو مضبوط کرنے کا کام لیا گیا۔ اور آخر کار صوبہ سرحد کا بہترین سرفروش نوجوان گروہ جس میں ایک طرف صنوبر حسین صاحب، عبدالرحمٰن ریا، عبدالغفور آتش، محمد یونس قریشی، اللہ بخش برقی، اور عزیز خوش باش تھے تو دوسری طرف کامریڈ رام سرن نگینہ، کامریڈ ساد ھو سنگھ، روشن لعل اچرج رام، نیکو دیوی، اور بخشی فقیر چند وغیرہ تھے۔ اس تنظیم نے ملک میں انقلابی اور عوامی اقدام کے ذریعے انقلاب کی دعوت دی۔ چنانچہ سرحد میں کسان کمیٹی کا قیام، کانگریس کے اندر ترقی پسند بلاک کی تشکیل اور دیگر انقلابی اور عوامی اداروں

کا قیام اسی تحریک کا مرہونِ منّت ہے۔ خود سوشلسٹ گروپ بھی اس گروہ سے پیدا ہوا۔ جب گاندھی جی صوبہ سرحد تشریف لائے تو ان کو صوبہ سرحد کے صحیح حالات سے روشناس کرانے کے لیے ایک وفد مرتب ہوا، جس کی قیادت مولانا عبدالرحیم صاحب نے کی۔ اس وفد میں صوبہ سرحد کے بائیں بازو کے تمام لوگ شریک تھے اور دادا[1] امیر حیدر جو کیونسٹ تحریک کے ہندوستان میں بانیوں میں سے ہیں، فرضی نام سے اس میں شریک تھے (چونکہ وہ روپوش تھے اس واسطے اصلی نام کو خفیہ رکھا گیا)۔

اس وفد نے گاندھی جی کو صوبہ سرحد کی تمام سیاسی تحریکات کے پس منظر سے واقف کرایا، اور کسان تحریک اور دیگر انقلابی تحریکوں سے ان کو آگاہ کیا۔

۱۹۲۸ء میں افغانستان میں برطانیہ کی حکومت کی سازش سے خانہ جنگی شروع ہوئی، جس نے پٹھان عوام کی بڑھتی ہوئی تحریکِ آزادی پر کاری ضرب لگائی۔ یعنی اعلیٰ حضرت شاہِ افغانستان امان اللہ خاں کی سامراج دشمن حکومت کے خلاف برطانی ایجنٹوں نے ملا شور بازار، شیخ محبوب علی خاں اور ہمفری کی جو اس وقت افغانستان میں برطانی کونسل خانہ کا افسر تھا، سرکردگی میں شورش شروع کرائی گئی، جو بچہ سقہ کی حکومت کے قیام کا باعث ہوئی۔ مولانا عبدالرحیم صوبہ سرحد میں پہلے شخص تھے، جنھوں نے اس سازش کے بین الاقوامی پہلو کو اجاگر کیا۔ مولانا موصوف حضرت شیخ الہند کے قریبی حلقوں سے متعلق ہونے کی وجہ سے

---

[1] دادا آج کل اپنے گاؤں میں مقیم ہیں اور کبھی کبھی راولپنڈی تشریف لاتے ہیں۔

جانتے تھے کہ امان اللہ کے خلاف بغاوت دراصل ہندوستان کی بڑھتی ہوئی تحریک آزادی کے خلاف سازش ہے۔ ولی اللّٰہی تحریک کا مرکز افغانستان میں ایک اچھے خاصے فعّال عنصر کی طرح کام کر رہا تھا جس کی رہنمائی کے فرائض مولانا سندھی کے باقی ماندہ ساتھی ادا کر رہے تھے۔ مولانا سندھی ۱۹۲۴ء میں ہی کابل چھوڑ چکے تھے۔ اور ان کے ساتھی منتشر ہو کر کچھ سرحدات میں اور کچھ سوویٹ ایشیا میں چلے گئے تھے۔ امان اللہ خاں کے خلاف اس شورش کے دوران مولانا عبدالرحیم نے قبائلی علاقہ کا دورہ کیا۔ اس سلسلہ میں مولانا نے مولانا شاکر اللہ اور حاجی عبدالمالک کے ہمراہ حاجی صاحب ترنگزئی سے ملاقاتیں کیں۔ اور کوشش کی کہ اس سازش کو کم از کم قبائل میں ناکام بنا دیا جائے۔ چنانچہ ان حضرات کی مساعی جمیلہ سے امان اللہ کے خلاف اس بغاوت کا اثر صرف شنواری قبیلہ اور افغانستان کی اندرونی خانہ جنگی تک محدود رہا۔ انگریزی سامراج کروڑوں روپیہ خرچ کرنے کے باوجود بغاوت کو عام نہ کر سکا۔ باقی امان اللہ خاں کیوں ناکام رہا؟ یہ ایک الگ بحث ہے۔

ملّا شور بازار کے خلاف پشاور میں جلوس نکالا گیا، جس میں اسے انگریزی سامراج کا ایجنٹ ظاہر کیا گیا۔ اُس کے پتلوں کو قصہ خوانی بازار میں جلایا گیا۔ اور اس طرح صوبہ سرحد کی عوامی قوتوں نے افغانستان کی خانہ جنگی میں گہری ہمدردی کا اظہار کیا۔ اور امان اللہ خاں کی سامراج دشمن پالیسی کی پُر زور حمایت کی۔ یہ سب مولانا عبدالرحیم کی ذاتِ گرامی اور ان کے ساتھیوں کے مخلصانہ عمل کا نتیجہ تھا۔ راقم الحروف نے بھی اس جدوجہد میں حصہ لیا۔ جب کچھ منتقہ

سے کے خلاف لڑنے کے لیے نادر خاں پشاور پہنچے تو طلبائے اسلامیہ کالج کے ایک وفد نے ان کو ایک سپاس نامہ پیش کیا۔ امیر نواز خاں جلیا نے پشتو والا ایڈریس پڑھا اور اردو وایڈریس فضل حق شیدا نے پڑھا۔ طلبہ نے نادر خاں پر زور ڈالا کہ وہ قندھار جائیں لیکن وہ اپنی تدابیر کو خفیہ رکھے ہوئے تھے۔ جب طلبہ "امان اللہ خاں زندہ باد" اور "سپہ سالار غازی زندہ باد" کے نعرے لگاتے تھے تو نادر خاں جواباً صرف "افغانستان زندہ باد" اور "طلبائے اسلامیہ کالج زندہ باد" کے نعرے لگاتے تھے۔ اس وقت نادر خاں نے طلبہ کے ایڈریس کے جواب میں یہ تاریخی الفاظ کہے تھے۔ "میرا کام صرف افغانستان کی ان قوتوں کو مجتمع کرنا ہے جن کی عقلیں فساد نے سلب کر رکھی ہیں۔ اس وقت بھی افغانستان میں نادر خاں سے بہتر افراد موجود ہیں لیکن وہ راہِ عمل دیکھ نہیں پاتے۔ اگر وہ جمع ہو جائیں تو افغانستان کو ایک صحیح راہ پر گامزن کیا جا سکتا ہے۔" طلبہ نے اپنی ہر قسم کی خدمات پیش کیں۔ اور میں بھی ان طلبہ میں سے تھا جو اس خدمت کے لیے تیار تھے۔

۲۳ر اپریل ۱۹۳۰ء کو پشاور کے مشہور بازار قصہ خوانی میں انگریزی حکومت نے گولی چلائی۔ یہ صوبہ سرحد کی آزادی خواہ قوتوں کے خلاف انتہائی وحشیانہ اقدام تھا۔ برطانوی حکومت نے اپنی ساری ڈپلومیسی کو بالائے طاق رکھ کر قصہ خوانی بازار کو وطن دوست نوجوانوں کے خون سے رنگا۔ اس دن کتنے باپ تھے جن کے جگر گوشے یتیم ہوئے۔ کتنی بیویاں تھیں جن کا سہاگ لٹ گیا۔ کتنی مائیں تھیں جن کی متاعِ حیات جاتی رہی۔ کئی اچھے اچھے گھر لٹ کے ویران

ہو گئے۔ مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کا شمار بھی اُن "مجرموں" میں تھا جو آزادی وطن کے لیے جدوجہد کر رہے تھے جن کو ظالم اور جابر حاکم کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی توفیق ہوئی۔ اور جن کی پُرسوز تقاریر دلوں میں آزادی وطن کی تڑپ پیدا کر دیتی تھیں۔ اس موقع پر مولانا عبدالرحیم کی گرفتاری عمل میں لائی گئی۔ اور ساتھ ہی ساتھ صوبہ سرحد کے وہ تمام حضرات، جو جنگ آزادی کا ہراول دستہ تھے، گرفتار کر لیے گئے۔ غرض صوبہ سرحد کے تمام سرکردہ لیڈر پابہ زنجیر تھے، جن میں علی گل خان، سید لعل بادشاہ، محمد خان میرجانی، عبدالرحمٰن ریا، اجرج رام، روشن لعل، میاں غلام ربانی، اللہ بخش برقی، پیر اخان اور رحیم بخش غزنوی۔ ان تمام حضرات کو پہلے بالاحصار کے مشہور قلعہ میں لے جایا گیا۔ پھر وہاں سے پشاور سنٹرل جیل بھیجا گیا۔ پشاور جیل کے عام قیدیوں نے جب حکومت وقت کا ان حضرات سے ناروا سلوک دیکھا تو ہڑتال کر دی، جسے نہایت سخت اور جابرانہ طریق سے دبا دیا گیا۔ پشاور سنٹرل جیل سے تمام حضرات کو گجرات سپیشل جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ اس جیل میں اس وقت ہندوستان کے بہت سے دیگر مشہور رہنما بھی محبوس تھے۔ اسی جیل میں احرار کے مشہور رہنما شیخ حسام الدین صاحب نے "غدر ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رُخ" کے عنوان سے ایک انگریزی کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب پر مولانا عبدالرحیم پوپلزئی نے مقدمہ لکھا۔ اس مقدمہ کے پڑھنے کے بعد ہی ایک انسان اندازہ لگا سکتا ہے کہ مولانا کو جنگ آزادی سے کتنا عملی اور فکری تعلق تھا۔ میں تو یہ کہوں گا کہ اصل کتاب سے مقدمہ کی سیاسی اور تاریخی اہمیت کہیں زیادہ ہے۔

مولانا عبدالرحیم نے گجرات جیل میں سیاسی رہنماؤں کو اپنی بلند اخلاقی اور بلند فکر کا

سے بہت متاثر کیا۔ اور اس طرح وہ اپنے لیے ان کے دلوں میں ایک اہم مقام پیدا کر لینے میں کامیاب ہوئے۔ گاندھی اروِن پیکٹ کے تحت دیگر سیاسی قیدیوں کے ساتھ آپ بھی رہا ہوئے۔ یہ فروری ۱۹۳۱ء کا واقعہ ہے۔ دسمبر ۱۹۳۲ء میں علاقہ اُتمان زئی میں جنگِ آزادی کے عنوان سے آپ نے تقریر کی، جس کی پاداش میں مولانا کو ۳ سال کی سزا دی گئی اور انھیں ہری پور جیل میں بھیج دیا گیا۔ ۱۹۳۴ء میں جب آپ رہا ہوئے تو حکومت سرحد نے آپ کو پشاور بلدیہ کے حدود کے اندر نظر بند کر دیا۔ مجھے مولانا سے پہلی دفعہ شرفِ ملاقات ۱۹۳۲ء میں حاصل ہوا، جب کہ میں بھی ہری پور جیل میں قید تھا۔

ہری پور جیل میں حضرت مولانا کے ساتھ رہتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ جنگِ آزادی جو خان عبدالغفار خان کی قیادت میں لڑی جا رہی ہے، وہ آزادی کے ٹھوس اور مثبت تصور سے خالی ہے۔ اگرچہ تحریک کے دو تین نعرے بڑے عوامی تھے، یعنی یہ کہ ہماری تحریک بھوکوں کو روٹی اور ننگوں کو کپڑا مہیا کرے گی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جنگِ آزادی کے حقیقی معنوں سے مولانا ہی نے مجھے روشناس کرایا۔ مولانا کا نہ صرف فکر اور مقاصد عوامی تھے بلکہ ان کا طریق کار اور تنظیم کا ڈھنگ بھی عوامی تھا۔ میں نے ہری پور جیل میں حضرت مولانا کی زیرِ ہدایت سیاسیات کا مطالعہ شروع کیا۔ مولانا ہی نے مجھے شاہ ولی اللہ دہلوی اور موجودہ یورپ کے عمرانی نظریات کی طرف متوجہ کیا۔ رہائی کے بعد ۱۹۴۴ء میں بڑی تگ و دو کے بعد مولانا کو حج بیت اللہ کی اجازت ملی۔ مولانا حجاز میں پورے دو سال مقیم رہے۔ اس قیام کے دوران آپ نے مولانا عبیداللہ

سندھی سے، جو اس وقت تحریک ولی اللّٰہی کے سلسلہ میں ایک اہم مقام رکھتے تھے، ہندوستان کی تبدیل شدہ سیاست کے بارے میں طویل تبادلۂ خیال کیا۔ اور حضرت سندھی کو کانگریس کے اندر کی قوتوں کی نئی تشکیل اور ان کے طبقاتی کردار سے آگاہ کیا۔ کئی معاملات میں دونوں حضرات متفق نہ ہو سکے۔ مولانا عبدالرحیم حجاز میں شاہی مہمان تھے۔ اسی قیام کے دوران میں مولانا نے مختلف کتب کا جو ہند میں نایاب تھیں، مطالعہ کیا۔

اس سفر کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے ایک دفعہ مجھ سے فرمایا کہ مقامِ عبودیت کی بعض اضافی نسبتوں کے بارے میں مجھے تردد رہا۔ یہ حقیقت مجھ پر حجاز میں منکشف ہوئی۔ اس سلسلہ میں مولانا فرماتے تھے کہ جو گروہ خلق کے دفع فساد پر مامور ہو، وہ مسلمان نہ ہو کر بھی مقامِ عبودیت پر فائز ہو سکتا ہے۔ بے شک یہ عبودیت اضافی ہو گی۔ اسی لیے انسانی طبقات کے مظالم اور رذائل کے رفع کرنے کو مولانا بہت بڑی عبادت قرار دیتے تھے۔

۱۹۳۴ء میں مولانا واپس وطن تشریف لائے۔ میں بھی زیارت کے لیے پشاور میں حاضر ہوا۔ سب احباب بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر مولانا ازراہ شفقت حجرہ کی دہلیز تک تشریف لائے۔ اور مصافحہ کے بعد فرمایا کہ عمر فاروق! میں تمہارے لیے عرب سے ایک تحفہ لایا ہوں۔ میں نے خیال کیا کہ شاید ویسا ہی کوئی تحفہ ہو گا جیسا حج کر کے آنے والے لوگوں کے لیے لایا کرتے ہیں۔ لیکن جب مجلس میں چائے وغیرہ ہو چکی تو مولانا نے فرمایا کہ میں عرب سے ایک تفسیر لایا ہوں جو حضرت ابوبکر جصاص رازی حنفی کی ہے، جو دو واسطوں سے امام محمدؒ کے شاگرد ہیں۔

انھوں نے اپنی اس تفسیر میں قومی زندگی کے احیاء کے لیے جماعت کی منظوری سے انفرادی تشدد کو جائز قرار دیا ہے۔ اور حضرت ایوب انصاریؓ کے واقعۂ قسطنطنیہ کو بطور دلیل کے پیش کیا ہے۔ یہ وہ مسئلہ تھا جس میں مولانا مرحوم سے مجھے اختلاف تھا۔ میں سمجھتا ہوں اور سمجھتا تھا کہ انقلاب عوامی شعور کی تبدیلی کی بنیاد پر ہی ہو سکتا ہے۔ انفرادی تشدد یا سازش سے یہ ناممکن ہے۔ لیکن مولانا بعض حالات میں ایسے افعال کو جائز بلکہ مستحسن خیال کرتے تھے۔ اور وہ فرماتے تھے کہ مردہ اقوام میں بہادروں کی انفرادی قربانی سے ہی زندگی پیدا ہو سکتی ہے۔ اور تاریخ عالم گواہ ہے کہ افراد نے اقوام کی قسمت کو بدلنے میں بڑی مدد کی ہے لیکن میرا خیال تھا کہ افراد مخصوص دور میں ایک خاص موڑ کے اظہار کا باعث بنتے ہیں اور سماج کی تحریکیں اپنی ضرورت کے لیے ایسے افراد خود پیدا کرتی ہیں۔ فرد اور جماعت دو الگ الگ نوع ہو کر بھی باہم اس طرح مربوط رہتے ہیں کہ ان کے کردار کو الگ کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ اس واقعہ سے مولانا عبدالرحیم صاحب کے جمہوری فکری رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ساتھیوں کو دلیل سے قائل کر کے ساتھ چلانا چاہتے تھے۔ وہ ذرا ذرا سی بات میں دلیل پر زور دیتے تھے۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں مولانا۔ وہ علم کا ایک سمندر تھے۔ اور میری مثال ایک قطرہ کی تھی۔

۱۹۴۷ء میں ہمارے صوبہ میں سب کی مشترکہ کوششوں سے وزارت بنی۔ ڈاکٹر خان صاحب نے حزبِ اختلاف کا قائد ہونے کی حیثیت میں سر عبدالقیوم صاحبزادہ کی وزارت کے خلاف اسمبلی کے ایبٹ آباد سیشن میں اپنی تاریخی عدم اعتماد کی تحریک پیش کی تھی۔ انھوں نے سر عبدالقیوم وزارت کو

شکست دے کر سرحد میں کانگریس کی پہلی مخلوط وزارت بنائی جو ڈیموکریٹک پارٹی اور کانگریس کے اتحاد سے بنی۔ اول الذکر پارٹی کی طرف سے خان محمد عباس خان آف بانسہرہ وزیر تھے۔ یہ صوبہ سرحد میں عوامی اور جمہوری زندگی کی ابتدا تھی، ورنہ انگریزوں نے اس کو سرزمین بے آئین بنا رکھا تھا۔ اور انگریزوں کی بالادستی میں خوانین کا دور دورہ تھا۔ کانگریس ہندوستان کے اکثر صوبوں میں کامیاب ہو چکی تھی اور وہاں اس نے وزارتیں بنائی تھیں۔ ایسا سوال تھا مرکز میں اقتدار کا اور اس کے لیے سیاسی و آئینی جنگ لڑی جا رہی تھی۔ اس وقت فیڈریشن کا قیام اور عدم قیام زیر بحث تھا۔ یہ جھگڑا دراصل ہندوستان میں مفاد خصوصی رکھنے والی قوتوں کے درمیان تھا۔ لیکن صوبوں میں کانگریسی وزارتیں بننے کی وجہ سے کانگریس کی بائیں بازو کی قوتوں کو اب صوبوں میں عوامی کام کرنے کے لیے مواقع مل سکتے تھے۔ اگرچہ انگریز گورنر کا ڈنڈا سر پر تھا لیکن پھر بھی عوامی کام کرنے کے لیے قانون کے اندر مواقع موجود تھے۔ چنانچہ اس دور میں کانگریسی وزارتوں نے جہاں کانگریس کے اقتدار کے لیے جدوجہد جاری رکھی، وہاں عوامی قوتوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتیں۔

ہندوستانی سرمایہ کو پہلی جنگ عظیم کے بعد جو مخصوص کردار حاصل ہوا اور جسے اس نے ۱۹۱۹ء سے لے کر اب تک اکٹھا کرنے کی کوشش کی، اس کی وجہ سے اس کی مخصوص شکل یہ ہو چکی تھی، کہ وہ برطانوی سرمایہ کا اقتصادی طور پر شریک بن کر ملک کے سیاسی اقتدار میں بھی اس کا شریک رہنا چاہتا تھا۔ صوبوں میں کانگریس کے حصول اقتدار کے بعد اب

بائیں بازو کی تحریکوں کو صرف اتنا موقع ملا تھا کہ وہ قوانین کے بعض اصلاحی پہلوؤں سے فائدہ اٹھا کر سماجی مظالم کے خلاف آواز بلند کریں۔

اس مرحلے پر آل انڈیا کانگریس میں دو ذہنی رجحانات وجود میں آ گئے۔ ایک رجحان اس بتدریج ترقی کرنے والے ہندوستانی سرمایہ کی نمائندگی کرتا تھا اور دوسرا رجحان ایک حد تک بائیں بازو کی تائید میں تھا۔ جیسے جیسے کانگریس تحریک کا دائرۂ اثر وسیع ہوتا گیا اور اس کی طاقت بڑھتی گئی، اول الذکر رجحان والے کانگریس کی تنظیم پر حاوی ہوتے گئے اور دوسرے رجحان والے اس دوران میں عوام میں تو ضرور کچھ نہ کچھ ہردلعزیزی حاصل کرتے رہے لیکن عملاً کانگریس کے اندر ان کی طاقت برابر کم ہوتی گئی۔ گاندھی جی کی ذات گو ان دونوں گروہوں کی مرجع تھی اور ان کا "دستِ شفقت" جواہر لال نہرو اور پٹیل دونوں پر یکساں تھا، لیکن کانگریس تنظیم پر تسلط رکھنے کی رو سے پٹیل گروپ کو گاندھی جی کی ذات سے عملاً زیادہ فائدہ پہنچتا رہا۔ چنانچہ ایک وقت آیا کہ پٹیل کانگریس کا مردِ آہن بن گیا، اور بائیں بازو والوں کو کانگریس سے نکلنا پڑا، یا وہ نکال دیے گئے۔



غلّہ ڈھیر کی کسان تحریک

سرحد کی عوامی قوتوں نے اپنے ہاں کی کانگریسی وزارت کے وجود سے فائدہ اٹھاتے ہوئے صوبے کے غریب اور مظلوم کسانوں کی تھوڑی بہت مدد کرنے کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلے غلّہ ڈھیر کے چھوٹے سے گاؤں میں جو نواب آف طورو کا تھا۔ اور نواب کے ظالمانہ ٹیکسوں سے لوگ تنگ تھے، اصلاحی کام شروع کیا۔ یہ صوبہ سرحد کی سیاست میں پہلا موقع تھا، جس میں مقامی خوانین کے خلاف جدوجہد کا آغاز ہوا۔ کسانوں پر اس سماجی ظلم کے پیچھے رواج کا روایتی قانون تھا۔ یعنی رواج کے طور پر نواب آف طورو کو ایسے ٹیکسوں کی وصولی کا حق تھا۔ اور وہ سرکاری طور پر انگریزی حکومت کی طرف سے بطور جاگیر دار اس حق کا مالک مانا گیا تھا۔ اسی مروجہ قانون کا سہارا نواب اور اس کے ساتھی لیتے تھے۔ مزید برآں حکومت کی مشینری پر بڑے بڑے خوانین کے لڑکے بطور افسر قابض تھے۔ غرض حکومت کا مروجہ قانون اور حکومت کے بڑے اہل کار دونوں غلّہ ڈھیر کے کسانوں کی دادرسی کی راہ میں حائل تھے۔ مولانا اور ان کے ساتھیوں سے ابتداءً یہ غلطی ہوئی کہ کسانوں پر کیے جانے والے ان مظالم کا پروپیگنڈا پریس اور

پلیٹ فارم سے نہ کیا گیا۔ ضلع مردان کے حکام نے اس سے فائدہ اٹھا کر کسان کمیٹی کے خلاف کارروائی کی اور تقریباً تین سو اشخاص مع مولانا امن عامہ میں خلل ڈالنے کے بہانہ میں گرفتار کر لیے گئے اور سب کو ہری پور جیل بھیج دیا گیا۔ یہ پہلی بار تھی کہ مقامی حکومت نے مولانا کو "سی کلاس" میں رکھا۔ صوبہ سرحد کی اسمبلی اور ہندوستانی اخبارات میں اس پر خوب ہنگامہ ہوا۔

دہلی میں منعقد ہونے والی کنونشن میں بائیں بازو کی جماعتوں کی مدد سے صوبہ سرحد کی کانگریسی وزارت کو خوب ننگا کیا گیا اور آخر میں ایک وفد اچاریہ نریندر دیو اور جے پرکاش نرائن پر مشتمل غلہ ڈھیر کے معاملات کی تحقیق کے لیے مقرر ہوا۔ اور افہام وتفہیم کے بعد مولانا اور ان کے ساتھی جن میں رام سرن نگینہ، ساوھو سنگھ، بھگت رام، عبدالغفور آتش وغیرہ تھے، رہا کر دیے گئے۔ اس کوشش میں اسمبلی کے اندر اس گروہ کا بھی بڑا ہاتھ تھا جو میرے بھائی حاجی فقیر خان ایم۔ ایل۔ اے، جمنا داس، لالہ حکم چند، اور ثمین جان وغیرہ پر مشتمل تھا۔ مجھے اس تحریک کے تمام پہلوؤں کا بخوبی علم نہیں۔ کیونکہ مولانا اور ان کے ساتھیوں نے یہ تحریک مقامی کسان کمیٹی کے ذریعے شروع کی تھی۔ میں نے صرف آخری ایام میں اس سلسلہ میں مدد کی تھی۔ بخشی فقیر چند دید جو اس تحریک کے متعلقین سے تھے، کہیں گرفتار نہیں ہوئے تھے، وہ میرے پاس آئے اور ہم نے مناسب طریقے سے اس مسئلہ کو کل ہند پلیٹ فارم تک پہنچایا تھا۔ اس تحریک کے بارے میں مفصل مواد رفیق رام سرن نگینہ کی کتاب "تحریک غلہ ڈھیر" سے مل سکتا ہے۔



ضلع ہزارہ کے کسانوں میں کام

رہائی کے بعد مولانا عبدالرحیم صاحب نے ملک امیر عالم اعوان اور میرے مشورے سے ضلع ہزارہ کی تحصیل مانسہرہ میں مزارعین کی پہلی کانفرنس منعقد کرنے کے سلسلے میں کام شروع کیا۔ ہمارا خیال تھا کہ پہلے ایک سادہ سا جلسہ ہو، کیونکہ ہمارا کام ابتدائی تھا۔ اور روپیہ پیسہ کی کمی تھی۔ لیکن مولانا اور میں نے دور دراز کے علاقوں میں دورے کر کے جب مزارعین کو بیدار کیا تو ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اور زمینداروں کے ظلم اور سماجی پس ماندگی کے خلاف غریب طبقہ نے کافی جوش و خروش سے حصہ لیا۔ ہمارا کام کبھی آگے نہ بڑھتا اگر اس سلسلہ میں ہم ضلع و صوبہ کانگریس کمیٹی کی تائید حاصل نہ کر لیتے۔ اس سے پہلے صوبہ سرحد میں ملک خدابخش مرحوم کی مساعی جمیلہ سے مالکان کے لیے قانون رواج کی جگہ قانون شریعت منظور ہو چکا تھا۔ ہمارا مطالبہ تھا کہ موروثی مزارعین پر بھی یہی قانون لاگو ہو۔ بظاہر تو یہ مطالبہ سادہ سا تھا لیکن جن لوگوں پر اس کا اثر پڑتا تھا وہ جانتے تھے کہ اس سے ان کو کہاں تک نقصان پہنچے گا۔

مالکان اراضی کو مزارعین پر قانون رواج کے لاگو ہونے کے دو فائدے تھے (۱) لاولد مزارع کا وارث مالک اراضی ہوتا تھا۔ اور اس کے ہاں اولاد

غیر نرینہ کی موجودگی میں بھی وراثت مالک اراضی کو ملتی تھی۔ (۲) اگر مزارع مالک اراضی کی تحریری اجازت کے بغیر اپنی اراضی کو بذریعہ رہن، بیع، ہبہ یا تملیک منتقل کرتا تو مالک اراضی کو حق تنسیخ حاصل تھا۔ یعنی وہ اراضی مذکورسکے سودا کو بغیر ادائیگی رقم منسوخ کرا سکتا تھا۔ تحریری اجازت کا حصول ایک طویل مرحلہ تھا۔ پہلے مزارع عدالت مال کے ذریعے مالک اراضی کو نوٹس دے۔ پھر اس نوٹس کی باقاعدہ تعمیل ہو۔ مالک کے عذرات کو سن کر عدالتِ مال فیصلہ کرے۔ تب یہ قضیہ کہیں ختم ہوتا تھا۔ بعض دفعہ تو عدالت کے جاری شدہ نوٹس کے بعد بھی سودا فسخ ہو جاتا تھا۔ اس کا مزارعین کی سماجی ساکھ اور ان کی معاشی حیثیت پر بہت اثر پڑتا تھا۔

صاف بات یہ تھی کہ زمین مزارع کے لیے نہ تو قرضہ کی ضمانت تھی، نہ ضروریاتِ زندگی کی ضمانت، نہ کسی حادثہ کے خلاف ضمانت۔ ان کے علاوہ مزارعین سے مالکان ظالمانہ قسم کے ٹیکس وصول کرتے تھے۔ اور پھر ہر گاؤں کا قانون رواج الگ تھا۔

بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ اگر کسی رقبۂ اراضی پر مثلاً ۵۰ ایکڑ رقبہ پر ۱۹۰۴ء میں پچاس روپیہ ٹیکس تھا تو ۱۹۱۸ء میں اگر اراضی دو حصوں میں بٹ گئی ہے اور ہر حصہ دار کو پچیس پچیس ایکڑ اراضی ملی ہے تو اب مالک کا ٹیکس پچیس ایکڑ اراضی پر بھی پچاس روپے ہی تھا۔ اسی طرح اگر ۱۹۰۴ء میں ایک اراضی کا ایک مالک تھا اور اب یہ اراضی دو مالکان کے حصہ میں چلی گئی تو بھی ٹیکس کی مقدار دوگنی ہو گئی۔ غرضیکہ اراضی گھٹتی تھی اور ٹیکس بڑھتے جاتے تھے۔

مولانا کی قیادت میں مزارعین پر ان مظالم کے خلاف جدوجہد شروع ہوئی۔ سردار عبدالرب نشتر نے، جو ایک وقت میں پاکستان کے وزیر صنعت رہے اور پھر مغربی پاکستان کے گورنر بنے، ایک ترمیمی ایکٹ مزارعان ان تمام امور کے لیے اسمبلی میں پیش کیا اور ہم نے اسے منظور کرانے کے لیے عوامی پلیٹ فارم سے جدوجہد شروع کر دی۔ حضرت مولانا نے شرعی حیثیت سے اس کی تائید میں فتویٰ دیا۔ اور ایکٹ منظور ہوگیا۔ خوانین نے سخت مقابلہ کیا اور مزارعین کی شرعی حیثیت کو چیلنج کیا۔ دارالعلوم دیوبند کی طرف استفتا بھیجے گئے۔ ہم نے بھی دورے شروع کیے۔ علاقہ میں بیداری کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ لیکن مولانا نے ہنگاموں کے بجائے تنظیم پر زور دیا۔ ہم دور دراز علاقوں میں پہنچ کر کسان کمیٹیوں کی تنظیم کرتے۔ اور راتوں کو کسانوں میں بیٹھ کر انھیں کسان کمیٹی کے اغراض و مقاصد سمجھاتے۔

ان علاقوں میں جہاں سواری کا فقدان تھا، راستے بے حد خطرناک تھے خود اس تحریک کے سوا ہمارے کوئی مددگار نہ تھے ہم نے دشوار گزار گھاٹیوں سے گزر کر دورے کیے۔ اور کسانوں تک پہنچے۔ بالا کوٹ کے خوانین نے ہم پر حملے کرنے کی کوشش کی۔ خوش قسمتی سے اس علاقے میں میری رشتہ داری ہمیں قتل ہونے سے بچا گئی۔ ورنہ خوانین تو قتل کا پختہ ارادہ کر کے آئے تھے۔ اور اس کی ہمیں اطلاع بھی ہو گئی تھی۔

مجہول علاقہ کوتش درہ بھوگر منگ میں ہمارے دورے نے طوفان برپا کر دیا۔ یہ ایک ایسا مقام تھا جو خوانین کا مضبوط گڑھ تھا۔ مزارعین کی

بستیاں منتشر تھیں۔ میں اس دورہ میں اپنے آپ کو خطرے میں محسوس کرتا تھا اس لیے کہ یہاں میری کوئی رشتہ داری نہ تھی۔ قبائلی علاقہ میں رشتہ داری بڑی چیز ہوتی ہے۔ پھر یہاں کے خوانین سب سے بڑھ کر ظالم اور بے رحم تھے۔ اور ان کے مزارعین بالکل غلاموں کا درجہ رکھتے تھے۔ خان کے خلاف زبان کھولنا تو درکنار مزارع خان کے سامنے بیٹھ کر روٹی نہیں کھا سکتا تھا۔ ضلع ہزارہ کے اس علاقے میں مجھے یوپی اور بہار کے بعض علاقوں کا نقشہ نظر آرہا تھا۔ ہمارے کچھ رفیق جو رضاکاروں کے طور پر ہمارے ساتھ تھے ۔ وہ جیوڑی سے جو کوشش کے دورہ کا سب سے پہلا گاؤں ہے ، ڈرا دھمکا کر واپس کر دیئے گئے تھے۔ اور حضرت مولانا ، میں ، مولوی فضل الٰہی ، مولوی فضل ربی کے چھوٹے بھائی اور میرے ایک رشتہ دار مسکین خاں ساکن ترنگڑی بالا آگے نکل کر پہاڑوں میں چلے گئے تھے۔ خوانین نے پیچھے سے ہمارا راستہ بند کر دیا تھا اور وہ چاروں طرف سے ہمیں گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے ۔ ہنجول کے مقام سے ہی گزر کر ہم دریا کے دوسرے کنارے تک جا سکتے اور مزارعین کے علاقے میں پہنچ کر کام کر سکتے تھے۔

میری اطلاعات کے مطابق خوانین نے ہمیں قتل کرنے کے لیے اپنے نوکروں کو تیار کیا تھا۔ اور اس سلسلے میں روپیہ وغیرہ مقدمات لڑنے کے لیے بھی جمع کر لیا تھا۔ میں نے مولانا مرحوم کو مطلع کیا۔ لیکن وہ بغیر خوف کے کام جاری رکھے ہوئے تھے۔ علاقہ میں ہمارے قتل ہو جانے کا پروپیگنڈا ہو چکا تھا اور شاید پولیس تھانہ میں بھی اطلاعات پہنچ گئیں۔ ہمارے ہنجول پہنچنے

کا جو وقت تھا، اس کے مطابق ہمارے ساتھیوں نے توکل علی اللہ مولانا کے حکم سے دریا کے پُل کو اسی مقام سے پار کیا۔ چنانچہ عین جنگل کے سامنے ہم پر حملہ ہوا۔ خوانین نے، ہماری اطلاعات کے مطابق اپنے نوکروں کو بھیجا جو بدمعاش اور جرائم پیشہ تھے۔ لیکن خود وہ نہیں آئے۔

ہم پر پتھر پھینکے گئے۔ اور ہمیں لاٹھیوں سے مارا گیا۔ لیکن قبل اس کے کہ ہمیں شدید زخم آتے، لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ خوانین کے نوکر ہمیں گالیاں دیتے ہوئے واپس چلے گئے۔ ہم کچھ زخمی ہوئے لیکن مولانا کو کوئی زخم نہیں آیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ میرا ایک سکول کا ساتھی پولیس سب انسپکٹر عبدالقدوس خان اتفاق سے موقع پر پہنچ گیا تھا۔ غالباً اس کی موقع پر موجودگی کا اثر تھا کہ ہم قتل ہونے سے بچ گئے۔ یہاں سے آگے چل کر ہم نے ٹل کے خوانین کے علاقہ میں داخل ہونا تھا۔ کو محمد عطائی خان ایم۔ ایل۔ اے مرحوم کے خاندان سے ہماری رشتہ داریاں تھیں۔ لیکن طبقاتی مفادات نے یہ سب اوجھل کر دی تھیں۔ مجھے نوکر کے ذریعے پیغام بھیجا گیا کہ ہمارے علاقہ میں داخل نہ ہونا۔ اگر اس کے باوجود تم داخل ہوئے تو ہم تمہاری کوئی ذمہ داری نہیں لیں گے۔ میں نے جواب دیا کہ آپ بالکل بے فکر رہیں، اور اپنے طبقہ کے خوانین کی مدد کریں۔ لیکن اب ہم دریا کے مغربی کنارے پر تھے جہاں ایک مضبوط کسان کمیٹی تھی۔ بابایاں نامی گاؤں کے کسانوں سے پہلے ہی خوانین مقابلہ میں ہار چکے تھے۔ رات کو ہم بابایاں پہنچ گئے۔ صبح کو خوانین درہ کے راہ گزر کو گھیر کر بیٹھ گئے تھے۔

پچھلے حملے کا مجھ پر کافی اثر تھا لیکن مولانا معمول کے مطابق کام کر رہے تھے۔

مجھے دکھ بھی تھا اور غصہ بھی اور کچھ اپنی بے تدبیری پر بھی ندامت تھی ۔ کیونکہ میں اس دورے میں اسلحہ ساتھ لا سکتا تھا اور ہم تینوں ساتھی مسلح ہو سکتے تھے۔ مقابلہ کی ضرورت کی صورت میں ظاہر ہے ہمارا کام آسان ہوتا۔ مولانا نے جب مجھے پریشان پایا تو فرمانے لگے دیکھو عمر فاروق :۔ " قرآن حکیم نبی کریم ؐ کو کیا اچھی بات کہتا ہے اور رب العالمین اپنے پیارے حبیب کو کیسے مخاطب کرتا ہے۔ وہ فرماتا ہے : کہ اگر تم کو نیک کام سرانجام دینے میں دکھ پہنچتا ہے تو تمہارے مخالف فریق کو بھی تو مقابلہ میں دکھ پہنچتا ہے۔ لیکن تم تو اللہ تعالےٰ سے نیکی کی امید رکھتے ہو۔ لیکن تمھارا فریق مخالف ایسی کوئی امید نہیں رکھتا۔" اس کے بعد فرمانے لگے کہ خیر کے کام میں دکھ تو پہنچتا ہے۔ لیکن نیکی کے بدلہ کی امید تو ہوتی ہے۔ مگر دکھ پہنچانے والے کو کوئی بدلہ کی امید نہیں ہوتی ۔

اس وقت حضرت مولانا کے اس ارشاد گرامی نے ہم پر ایک مہمیز کا اثر کیا۔ اور ہم تیزی سے منزل مقصود کی طرف چل پڑے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گویا کوئی واقعہ پیش ہی نہیں آیا۔ شام کو بیس پچیس میل کا سفر طے کر کے ہم کسانوں کے مرکز پر پہنچے۔ ہم میں سے ہر ایک تھکا ہوا تھا۔ اور آرام چاہتا تھا۔ لیکن مولانا جاتے ہی کسانوں کو مخاطب کرنے لگے ، جو بڑی بے قراری سے ہمارا انتظار کر رہے تھے ۔ نماز ادا کرنے کے بعد مولانا ہمیں تسلی دیتے رہے اور صحابہ کرام رضؓ اور حضورؐ کے اسوۂ حسنہ سے متعدد مثالیں بیان کر کے ہمیں مطمئن کرنے کی کوشش کرتے رہے ۔

آپ نے فرمایا یہ انقلاب کی ابتدائی منزل ہے کہ لوگ آپ کا پیغام

جو دراصل اُن کے مفاد اور بہبود کا پیغام ہے، سننے کے واسطے تیار ہو جائیں۔ عمل کا درجہ بعد میں ہے۔

صبح کو ہم نے بٹل کے خوانین کے راستہ کو چھوڑ کر ایک دشوار گذار پہاڑی راستہ سے کسانوں تک پہنچنے کی کوشش کی۔ اور اس طرح خوانین اپنی تدابیر میں ناکام رہے اور ہم صحیح و سلامت شنگیاری پہنچ گئے۔ ہمارے ان دوروں کے بعد جب مانسہرہ میں کانفرنس ہوئی تو تقریباً ایک لاکھ کسانوں کا اجتماع ہوا۔

ان مظاہروں، جلسوں اور جلوسوں نیز کسانوں کی باقاعدہ تنظیم کا نتیجہ تھا کہ ڈاکٹر خانصاحب وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد کو ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرنی پڑی تاکہ وہ مزارعین اور مالکان کے تعلقات کی کشیدگی کے اسباب معلوم کرے اور رفع کشیدگی کے لیے تجاویز پیش کرے۔ اس کمیٹی کے تقرر کے سلسلہ میں ڈاکٹر خانصاحب کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

محمد عباس خاں مرحوم، قاضی عطاء اللہ صاحب مرحوم اور بھجو رام گاندھی ڈاکٹر خانصاحب کی کابینہ کے یہ تین وزراء اس کمیٹی کے تقرر کے مخالف تھے۔ بھجو رام گو بہت زیادہ مخالفانہ تھا۔ لیکن اکثریت سے خائف تھا۔ لیکن ہمارا مطالبہ تھا کہ تحقیقات کی جائے اور اس مطالبہ کی پشت پر ایک عوامی تحریک تھی۔ ڈاکٹر خانصاحب کو غلہ ڈھیر کی تلخی یاد تھی۔ مطالبہ اتنا معقول تھا کہ ڈاکٹر خانصاحب کے لیے کوئی راہ فرار نہ تھی۔ دوسری طرف ساتھی وزراء کی مخالفت تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے جب فیصلہ کیا کہ تحقیقات ہو کر رہے گی تو اب وزراء نے اس تحقیقات کو دوسرے ڈھنگ سے ناکام بنانے کی کوشش کی۔ اس

کمیٹی میں راسئے بہادر الیشر داس جو شمالی ہندوستان کا سب سے بڑا سرمایہ دار تھا اور عبدالغفور خاں (چارسدہ) کو جو اس وقت چیف پارلیمنٹری سیکریٹری تھے اور چارسدہ کے بڑے خوانین میں سے ایک تھے، نامزد کیا گیا۔ یہ دونوں حضرات مزارعین کے طبقاتی مفاد کے مخالف تھے۔ اس اعلان پر ہم نے باہمی مشورہ کیا۔ کیونکہ کمیٹی کے ارکان کے تقرر میں ہمیں شکست ہوئی تھی۔ ملک امیر عالم اعوان اور کئی دیگر کسان رہنماؤں نے کمیٹی کا بائیکاٹ کرنے کی رائے دی۔ لیکن میرا خیال تھا کہ ہمارا معاملہ اتنا صاف ہے کہ اس میں یقیناً خوانین کو شکست ہو گی۔ اور اگر ہم کسانوں کے لیے ابتدائی حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس سے کسانوں کو اپنی تنظیم میں اعتماد پیدا ہو جائے گا۔ مولانا نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ اور ہم سب دوستوں نے مل کر کمیٹی سے تعاون کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

خوانین علاقہ کا طرزِ عمل بڑا مشتبہ تھا۔ کمیٹی کے ساتھ ہمارے تعاون کرنے کے فیصلہ کے بعد مانسہرہ کے مقام پر کمیٹی کے ارکان کا اجلاس ہوا۔ پہلا دن تھا اور ارکان کو شہادتیں لینی تھیں۔ میں، ملک امیر عالم اور میرے بھائی صاحب حاجی فقیر خاں جو اس وقت ایم۔ ایل۔ اے تھے اور کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کے چیف وہیپ تھے۔ اور دیگر کسان رہنماؤں نے شہادتیں دینے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے مختلف دیہات کے قانون رواج کی نقول حاصل کر لی تھیں۔ اسی اثنا میں خوانین کا ایک گروہ زیر قیادت خان بہادر علی گوہر خاں رئیس مانسہرہ آیا اور میرے بھائی سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ہمیں ان کی سازش کا قطعی علم نہ تھا۔

گلہ شکوہ کرتے کرتے انھوں نے میرے بھائی پر علین مانسہرہ کے ڈاک بنگلہ میں پولیس اور افسروں کی موجودگی میں حملہ کر دیا اس نیت سے کہ فساد کی وجہ سے تحقیق رک جائے گی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ پولیس موجود تھی۔ اور اگر پولیس وقت پر مداخلت نہ کرتی تو شاید قتل ہو جاتے۔ جب خوانین کو اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تو انھوں نے کمیٹی کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ پہلی شہادت ملک امیر عالم صاحب اعوان کی ہوئی، جنھوں نے نہایت فاضلانہ طریق سے قانون مزارعین ہزارہ پر روشنی ڈالی۔ ہمارے ہاں ایکٹ مزارعان پنجاب جو کہ ہزارہ کے مزارع ریگولیشن سے ترمیم ہو کر لاگو ہو چکا تھا۔ ملک امیر عالم نے ایکٹ مزارعان پنجاب اور ہمارے ایکٹ کے فرق کو بتایا اور ثابت کیا کہ یہ قانون ترمیم سے اور بڑا ہو گیا ہے۔

دوسری شہادت میری تھی۔ میں نے قانون رواج کے اس پہلو کو جو ممبران کمیٹی کے سامنے پیش تھا کہ مزارع کی اراضی گھٹتی ہے لیکن ٹیکس بڑھتا ہے، نمایاں کیا اور مختلف دیہات کے واجب الارض کا حوالہ دے کر بتایا کہ ہر گاؤں کا قانون الگ ہے۔ اور سب سے ظالمانہ قانون کاغان کا ہے۔ میں نے ایک مثال یہ دی کہ قانون رواج میں بعض جگہ "فی کھاتہ"، "فی گھر"، "فی دھواں" کا لفظ ہے کہ مزارع اس حساب سے مالک اراضی کو لگان اور جو بات ادا کرے گا۔ چنانچہ اگر ۱۹۰۴ء میں دو سو کنال اراضی پر ایک گھر شمار ہوتا تھا تو ۱۹۳۵ء میں وہ چار گھر بن چکا ہے۔ اسے کمیٹی کے ہر دو اصحاب نے نہ مانا کہ یہ کس طرح ممکن تھا کہ اراضی گھٹے اور ٹیکس بڑھے۔

میں نے مسٹر پارین ریونیو اینڈ ڈویژن کمشنر پشاور کے فیصلہ کا حوالہ دیا اور مزارعین نے بھی میری تائید کی۔ کمیٹی کے ارکان شہادتیں سننے کے ساتھ ساتھ کاغذات مال کا ملاحظہ بھی کرتے جاتے اور جب ان پر حقائق واشگاف ہوتے تو حیران رہ جاتے۔

آخر میں کمیٹی نے مزارعین کے حق میں ایک تاریخی رپورٹ لکھی اور خوانین کے تمام مظالم کو آشکارا کیا۔ رپورٹ کا ابتدائی مسودہ عبدالغفور خاں مرحوم نے لکھا تھا اور سارا زور قلم خرچ کر دیا تھا۔ یہ رپورٹ ابھی تک خفیہ دستاویز ہے۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد جب عبدالقیوم صوبہ کا وزیر اعلیٰ بنا اور اس نے ضلع ہزارہ میں زرعی اصلاحات کیں تو اس کی ان اصلاحات کی بنیاد یہی رپورٹ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ عبدالقیوم نے مزید تحقیق بھی کرائی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس رپورٹ نے اسے اصلاحات نافذ کرنے میں بڑی مدد دی ہے۔

آج بھی جب کہ مولانا مرحوم کی موت کو ایک عرصہ ہو چکا ہے ہزارہ میں مولانا کا نام مزارعین کے سامنے لیا جائے تو وہ دلوں میں ایک حرارت محسوس کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جنگ آزادی کے اس سپہ سالار کو ضلع ہزارہ کا کونہ کونہ یاد رکھے گا۔ جس نے اس مظلوم آبادی کے حالات کو دنیا پر پہلی بار آشکارا کیا اور اس کے لیے انصاف کا مطالبہ کیا۔



سیاسی نظریہ

حضرت مولانا کے سیاسی نظریہ کے بارے میں بحث کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ میں عرض کردوں کہ مولانا اُس وقت کی سیاسی گروہ بندیوں سے بہت بلند تھے۔ وہ ان مفکرین میں سے تھے جنھوں نے ہمارے سماج کی دھڑا بندیوں کو نزدیک سے دیکھا اور جنھوں نے بڑے سے بڑے اشخاص کی زندگیوں پر جرح و تعدیل کی۔ وہ امیروں اور غریبوں سے یکساں طور سے ملتے تھے، اور دونوں طبقوں کے خصائص اور رذائل سے خوب آگاہ تھے۔ وہ ان لیڈروں میں سے نہ تھے جنھوں نے دنیا کو اخباروں میں پڑھا ہے۔ جو دفتروں میں بیٹھ کر محض رپورٹوں سے غلط اندازے لگاتے ہیں۔ جو احکام تو صادر کرتے ہیں، لیکن ان احکام کے عوامی تعلق سے ناواقف ہیں۔ جن کا علم محض کتابوں سے ماخوذ ہے۔ جو عوام کی زندگی سے قطعاً ناآشنا ہیں۔ جو صرف شہروں کی پکی سڑکوں پر "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہیں۔ جو زمان اور مکان کے رشتوں سے کٹے ہوئے ہیں۔ جو دنیا کے حقائق سے بے خبر ہوتے ہوئے بھی عقل کل ہونے کے مدعی ہیں۔

مولانا فرماتے تھے کہ انسان کو کامل معرفت مشکل سے حاصل ہو سکتی

ہے۔ استقرائی اور استخراجی طریق کے استعمال کے بعد بھی علوم کے بعض پہلو مخفی رہتے ہیں۔ اور یہی انسانی سوسائٹی میں ردِ انقلاب کا سبب بنتے ہیں۔

مولانا ایک مذہبی رہنما تھے۔ وہ مفتیِ سرحد تھے۔ وہ بنیادی طور پر ولی اللٰہی طرزِ فکر کے قائل تھے اور آزادیِ ہند کی تحریک میں وہ اسی گروہ سے متعلق تھے۔ وہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے شاگردانِ رشید میں سے تھے لیکن وہ موجودہ صنعتی دور میں ولی اللٰہی تحریک کو نئے رشتوں سے متعین کرنے کے حق میں تھے۔ اس سلسلے میں وہ قیامِ مکہ کے دوران مولانا عبید اللہ سندھی سے اس امر پر بحث و تحیص کرتے رہے کہ ہند کی عوامی تحریک کو آج کی دنیا میں بین الاقوامی طور پر کس طرح متعین کیا جائے۔ یاد رہے کہ ہندوستان کی ولی اللٰہی تحریک تاریخ کے مختلف ادوار میں دنیا کی مختلف قوتوں کے مراکز سے متعلق رہی ہے۔

پہلے دور میں یہ سوچا گیا کہ ہند کے شمالی علاقہ میں، جس میں حکومت افغانستان بھی شامل تھی، اپنے اثر کو بڑھا کر ہند کی تحریک آزادی کی مدد کی جائے۔ چنانچہ اس دور کے لٹریچر میں ہمیں ولی اللٰہی تحریک میں افغان دوستی کے جذبات ملتے ہیں۔ اور اس تحریک کے اکثر بزرگوں کی افغانی طلبہ سے ربط و محبت اسی وجہ سے تھی۔ لیکن یہ دور بدلا اور جب اسلامی ممالک کی تحریک آزادی کا مرکز حکومت ترکیہ قرار پایا تو ان حضرات نے حکومت ترکیہ سے اتصال کو ضروری قرار دیا۔ چنانچہ دوسرے دور میں حجاز میں مقیم حضرات خصوصاً تحریک کے اس وقت کے رہنما حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے مفتیِ مکہ کے توسط سے سلطان ترکی سے اتصال پیدا کیا۔ تحریکِ خلافت میں دیوبندی حضرات کی شرکت اسی بنا پر تھی۔ حکومت ترکیہ

کے زوال اور جمہوریہ ترکیہ کے قیام کے بعد ترکی حکومت نے کسی بھی بین الاقوامی ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر ان حضرات نے اپنے آپ کو ہند کی آزادی کی تحریک سے، جو مضبوط قومی تحریک کی شکل اختیار کر چکی تھی، وابستہ کرنا ضروری سمجھا۔ لیکن کانگریس کی تحریک تمام ہندوستانی عوام کی صحیح تحریک نہ بن سکی۔

ہندو پارسی سرمایہ کے اتحاد اور برطانی سرمایہ سے ان کے اتصال نے اس تحریک کی عوامی شکل کو مسخ کر دیا تھا۔ یہ تحریک سامراج دشمن ضرور تھی۔ لیکن اپنے بطن میں سامراجی عزائم بھی رکھتی تھی۔ کیونکہ ہر سرمایہ جب ترقی کرتا ہے تو وہ سامراج کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اگر پیداآوری قوتوں کے لیے اشتراکی خصائص نہ پیدا ہوں۔ دراصل اشتراکیت اور آج کی منصوبہ بند سرمایہ داری ایک ہی منظر کے دو پہلو ہیں۔ ایک کا منتائے پیداوار منافع ہے اور دوسرے کا استعمال۔

مولانا عبدالرحیم صاحب نے مولانا عبیداللہ سندھی سے کانگریس کے سیاسی کردار کے بارے میں طویل بحثیں کیں لیکن مولانا سندھی اپنے موقف سے نہ ہٹے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ کانگریس میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیں گے۔ لیکن مولانا عبدالرحیم کہتے تھے کہ اب کانگریس کے اندر کسی بھی عوامی تحریک کے لیے جگہ نہیں۔ آج کانگریس ہندو سرمایہ کی علمبردار ہے۔ اور ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک کی جدوجہد نے اس صورت حال کو آشکار کر دیا ہے۔ لیکن مولانا سندھی آخر تک اسی غلط فہمی میں مبتلا رہے۔

مولانا عبدالرحیم فرماتے تھے کہ اب ولی اللہی تحریک کو ہند کی عوامی تحریک میں اپنا مقام پیدا کرنا چاہیے۔ اور آنے والے انقلاب کو دینی رنگ میں ڈھالنا

چاہیے۔ آپ علماء سے کہتے تھے کہ اگر دین کی بنیاد کو بچانا چاہتے ہو تو دین کو انقلاب کا راستہ مانو۔ اگر دین انقلابی صلاحیتیں کھو چکا ہے تو وہ مردہ ہے۔ اسے کسی طرح بھی نہیں بچایا جا سکتا۔ اگر تم مانتے ہو کہ ہمارا دین قیامت تک رہے گا، تو قیامت تک کے اقتصادی رشتوں کے تعین اور ان میں واقع ہونے والے تضاد کا حل دین سے نکالو۔ اور عوام کے موجودہ مصائب کو دین کی مدد سے دور کرو۔ ہمارا دین جاگیرداری یا سرمایہ داری کے تحفظ کے لیے نہیں آیا۔ یاد رکھو! ایک طرف ہمارے دین نے عرب کے مرتے ہوئے غلام داری سماج کی مخالفت کی تو دوسری طرف اس نے عرب میں تجارتی سرمایہ داری نظام کی حمایت کی۔ لیکن ساتھ ہی تجارتی سرمایہ داری میں ربوٰ کی مخالفت کی۔ یعنی محض منافع انسانی پیداوار کا منشا نہ ہوگا بلکہ باہمی امداد اور ضروریاتِ انسانی کو پورا کرنا منشائے پیداواری ہوگا۔

ہمارا دین سرمایہ کو مانتا ہے۔ تجارت کو مانتا ہے۔ وہ سرمایہ داری کے نظام کو موجودہ انسانی سوسائٹی کی اصل نہیں مانتا۔ وہ سرمائے پر حکومتِ وقت کو عامۃ المسلمین کے مفاد کی خاطر زیادہ سے زیادہ کنٹرول کا حق دیتا ہے۔ ہمارا دین سرمایہ کو حصول معاش کا ذریعہ مانتا ہے۔ اسے مقصدِ زندگی نہیں مانتا۔ سرمایہ انسانی زندگی کی بقا کا ایک سبب ہے۔ انسانی زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ ہمارا دین تخلیقِ کائنات کا منشا بندگی قرار دیتا ہے۔ انسانی زندگی کو پُر امن بنا کر اللہ سے واصل کرانے کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ ہم تمام ادیان میں خیر کو علّتِ مشترک مانتے ہیں۔ قرآن بار بار کہتا ہے کہ میں پہلے انبیاء کے صحیفوں میں

موجود تھا، ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں میں۔ میں زُبُرِ اولین میں تھا۔ ظاہر ہے کہ اُن ادیان کی زبان عربی نہ تھی۔ رسم الخط عربی نہ تھا۔ عربی تلفظ نہ تھا۔ ایک دوسرے سے رسم الخط مختلف، زبان مختلف، تلفظ مختلف، پیرایۂ بیان مختلف۔ تو سوائے خیر کے ان ادیان میں کیا اشتراک تھا۔ اور یہی خیر اساسِ دین ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں شر اساسِ کفر ہے۔ اور کفر کا ملت واحدہ ہونا بھی اس سے ثابت ہے۔ مولانا فرماتے تھے کہ جب خیر مشترک ہے تو ادیان اور امم میں فرق کیسے ہوا؟ مولانا کا ارشاد تھا کہ خیر اپنے اضافی ماحول سے متعین ہوتا ہے۔ اور ایک ماحول میں خیر کا یہی تعین شعائر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ ادیان کے شعائر مختلف ہوتے ہیں، لیکن ان کی اساس مشترک ہوتی ہے۔ اس کی مثال حضورؐ کی یہ حدیث ہے۔ بچہ دینِ فطرت یعنی اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اس کو یہودی، نصرانی اور مجوسی بناتے ہیں۔ یہ سب شعائرِ امم ہیں۔ اس سے ادیان کی اساسی اشتراک کے باوجود امم میں دین کے افتراق کا پتہ چلتا ہے۔

ملل مختلفہ میں شعائر کے اختلاف سے دین کے فہم اور عمل میں فرق پڑتا ہے۔ انسان اجتماعِ انسانی کے مقرر کردہ اور عمل کیے ہوئے قوانین کو شعائر مانتا ہے اور یہ دین میں داخل ہو کر دین کا حصہ بن جاتے ہیں، اور جہلا یا خود غرض طبقے اسی کو اصل دین تصور کرتے ہیں۔ لیکن شعائر خارجی حرکات و عوامل سے متاثر ہو کر بدلنے پر مجبور ہیں اور وہ بدلتے رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ دین کی ظاہری شکلیں بدلتی رہی ہیں۔ لیکن اصل دین ایک ہی رہا، یعنی خیر کی تلاش و حصول۔ دین کی شکل میں یہ تبدیلی زمان اور مکان کے اختلاف سے ہوئی

اور یہی ادیانِ مختلفہ کی تشریح ہے۔ خیر کی تلاش و حصول کا طریق ایک جامع حیثیت سے قوموں کا ضابطۂ اخلاق بن جاتا ہے، جو انسانوں کے لیے فرداً فرداً اور مجموعی طور پر ان کے حقوق و فرائض کا تعین کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ضابطہ اخلاق میں علتِ خیر کے تلاش و حصول کے باوجود باہم اختلاف ہوتا ہے۔ مثلاً زرعی علاقوں میں زرعی رشتوں کی تقدیس ہے۔ تجارتی سرمایہ کے دور میں تجارتی رشتوں کی تقدیس ہے۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہاں ضابطۂ اخلاق الگ الگ ہے لیکن بعض قوانین میں اشتراک اساسی ہے۔ اس طرح نظامِ عالم رواں دواں ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ زیبِ چمن یہی اختلاف ہے۔ جو کبھی تو خود تضاد ہوتا ہے اور کبھی غیر اس کا تضاد ہوتا ہے۔ یہ خیر و شر کا باہمی تضاد اور اشتراک ہی اصل مسئلہ ہے۔ عابد و معبود کا اشتراک اور تضاد۔ خالق و مخلوق کا اشتراک و تضاد۔ یہی وحدت الوجود کی اصل ہے۔ مولانا کا کہنا تھا کہ خیر و شر ایک ہی ظہور کے دو پہلو ہیں۔ جنھیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ حرکت زمانی و مکانی سے اپنے اپنے وجود کو متعین کرتے ہیں، اور یہی حرکت زمانی و مکانی خیر و شر کے تعین میں فرق ڈالتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عبادات کی شکلیں مختلف ہیں۔ نیز مختلف اقوام میں حصول خیر کے راستے مختلف ہیں۔

مولانا خیر و شر کے تعین کو انسانی سوسائٹی کی حرکت و ارتقا کے مختلف مقامات سے تعبیر کرتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ اس مسئلہ میں نظام معتزلی نے فلسفۂ اسلامی کی رہنمائی کی تھی لیکن وہ اپنے خیالات کو کسی نظم و ضبط کے تحت نہ پیش کر سکا۔ جیسا کہ اس کے ہم عصروں کا حال ہوا۔ اس کا نظریۂ "طفرہ"

باوجود اختلاف رائے کے، بہت سے مظاہر قدرت کی تشریح کے لیے مشعل راہ ہو سکتا ہے۔ یہی چیز ہیگل نے پیش کی۔ پھر اگر اخوان الصفا کے فلسفہ پر غور کیا جائے تو وہ یورپ میں ان اشتراکی نظریوں سے ملتا جلتا ہے، جو ہوائی قسم کی اشتراکیت کے قائل تھے۔ کارل مارکس کی یہی خوبی ہے کہ اس نے ان تمام اغلاط کی چھان بین کر کے منضبط طور پر انسانی سوسائٹی کی تاریخ کو اس وقت کے اعداد و شمار کی روشنی میں پیش کیا۔ لیکن یہ کہ وہ حرف آخر ہے، غلط ہے۔ اس نے چیزوں کے علم کے لیے جدلی طریق فکر پیش کیا۔ اور چند قوانین بھی پیش کیے۔ وہ قوانین مارکسی نظریہ کہلاتے ہیں۔ لیکن خود مارکس کا اقرار تھا کہ یہ حرفِ آخر نہیں۔ مارکس شاہ ولی اللہ کی طرح استقرائی اور استخراجی دونوں طریق تعین کے بیک وقت استعمال کا قائل ہے۔ ایک مظہر قدرت کی تشریح کرتے ہوئے اس کی ضد کی بھی تشریح ہو جاتی ہے۔



جدلیت اور اخلاقی قدریں

مولانا فرماتے تھے کہ حرکت میں تسلسل کا تصور ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ کہ یہ تسلسل ہموار ہوتا ہے، غلط ہے۔ حرکت مسلسل ہے لیکن ہموار نہیں۔ اسی وجہ سے مختلف اقوام میں صورتِ حال یکساں نہیں۔ اور خود قوم کے اندر افراد کی ترقی کے مدارج مختلف ہوتے ہیں۔ اسی حرکت کے غیر ہموار ہونے سے مختلف اقوام وملل میں اور تمام انسانی سوسائٹی میں ہمیں مختلف طبقات ملتے ہیں۔ اور اسی کا وہ نتیجہ بھی ہوتے ہیں۔ ورنہ تخلیق میں اشتراک کے باوجود مختلف طبقات کا وجود سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اب مارکس اس کی تشریح صرف ذرائع پیداوار کی تبدیلی سے کرتا ہے حالانکہ ذرائع پیداوار دیگر وجوہ میں سے ایک وجہ ہے۔ اس مظہرِ قدرت کی تشریح صرف ذرائع پیداوار کی تبدیلی سے کرنا غلط ہوگا۔ عمیق نگاہ سے دیکھیں اور خود جدلی طریق تحقیق استعمال کریں تو ان اختلافات میں مکان کا بڑا دخل ہے۔ ورنہ ہمیں جغرافیہ کے تمام قوانین کی نفی کر کے ارتقائے انسانی کو صرف ذرائع پیداوار کے قوانین کی تبدیلی کے تحت کرنا ہوگا۔ اور قدرت کے ان مخلوط مظاہر کو بالکل سادا اور مشینی طور پر خیال کرنا ہوگا۔

مولانا فرماتے تھے کہ اگر ہم بنی آدم کے وجود میں آنے کو کسی بھی نظریہ کی

رُو سے مان لیں خواہ وہ نظریہ ابداع ہو یا نظریۂ تخلیق ہو۔ نتیجہ اس کا ایک ہی ہے کہ نسلِ آدم کی ابتدا ایک آدم یا جنسِ آدم سے ہو سکتی ہے۔ وہ کہاں اور کس مقام پر ہوئی، مارکسیت کی ساری تاریخی چھان بین اس کا قطعی جواب مہیا نہیں کر سکتی۔ مارگن اور ڈارون کے نظریے اور تحقیق بھی اس کی عقدہ کشائی نہیں کر سکتی۔ آج علم حیوانات اور علم نباتات کی تمام تحقیق ہمیں ذرۂ حیات تک لے گئی۔ اس کی اجزائی ترکیب بھی دریافت ہو گئی لیکن ابھی تک رازِ حیات ایک راز ہی ہے۔ (مغرب کی نئی تحقیق نے زندگی سے پہلے کا دور بھی مادہ میں معلوم کر لیا ہے اور بعض محققین نے رازِ حیات کی دہلیز پر خود کا کھڑا ہونا بیان کیا ہے ـــــ فاروق)۔ بے شک زندگی ایک حرکت ہے لیکن حالات و حرکات کے اقتضا سے اس میں فرق مراتب پایا جاتا ہے۔ یعنی الف کے حالات و حرکات (خارجی اور داخلی دونوں حرکات) کا نتیجہ الف اور ب کے حرکات و حالات کا نتیجہ ب ہے۔ اگر ان حالات کو باہمی بدل دیا جائے تو نتیجہ بالکل برعکس ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ طبقات میں حرکات اور مقامات کی تبدیلی سے طبقات کے وجود اور مقتضیات میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔

کل جاگیردار اپنے وجود کو ظلِ اللہ کہتا تھا۔ اور خود مسلمان قوم میں "السلطان ظل اللہ فی الارض" کا تصور اسی دور کی عکاسی کرتا ہے۔ لیکن حرکات کی تبدیلی سے نئے علوم کی دریافت ہوئی۔ اور اس سے سرمایہ داری دور کا وجود متعین ہوا۔ اس دور کے سارے لٹریچر میں باہمی جنگ نظر آتی ہے۔ نظریات میں جنگ۔ سوسائٹی کے اداروں کے قیام میں جنگ۔ یہ جنگ جاگیرداری

سماج کی مکمل شکست سے ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ کیا ساری انسانی سوسائٹی میں جاگیرداری سماج کو ایک ہی طرح اور ایک ہی راستہ سے شکست ہوئی۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ ہر قوم اور ملت نے الگ الگ راہ اختیار کی، جو قوانینِ تاریخ، قوانین جغرافیہ اور قوانین تخلیق کی مشترکہ تبدیلی سے متعین ہوئی۔ تمام اقوام اپنے اپنے کردار میں جہاں موٹے موٹے اصولوں میں ایک طرح ہیں، وہاں ان میں باریک باریک فرق اجتماعی طور پر ایک نمایاں فرق پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح آج کے دور میں سرمایہ اپنی تنظیم کے سہارے اپنے وجود کی تقدیس کرتا ہے۔ وہ سوسائٹی کے تمام ضوابط کو اسی نقطۂ نگاہ سے ترتیب دے رہا ہے۔ اور وہ عوام کو ان اداروں سے جو اس نے ترتیب دیے ہیں، متاثر کر رہا ہے۔ لیکن یہی ادارے اپنی ضد کو بھی بالواسطہ طور پر ان وسائل ہی سے وجود میں آنے کی سہولت مہیا کر رہے ہیں، جو ان وسائل کو سرمایہ کی دوسری شکل کی ترتیب کے لیے استعمال کرے گی۔ یہ مقام، مقامِ انقلاب ہو گا۔ اور یہ طبقات کی شعوری اور اجتماعی تبدیلی سے ہو گا۔ لیکن یقیناً سرمایہ داری سماج میں علتِ تغیر موجود ہے۔ اور یہی علتِ پیداوار ہے۔ آج اس کا منشا منافع ہے۔ کل استعمال ہو گا۔ بے شک تصور تغیر میں فرق ہو گا، علت تغیر میں فرق نہیں ہو گا۔ کل جاگیرداری سماج میں بھی یہی علت تھی۔ البتہ غایت مختلف تھی۔

یہ کیوں ہوتا ہے؟ مولانا فرماتے تھے کہ قدرت کا یہ عمل اور ردِ عمل اور ارتقاء حرکت کا نتیجہ ہے۔ مادہ پرست لوگ کسی خارجی حرکت کو نہیں مانتے لیکن

اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ وہاں ہی اسے تعین مانتے جہاں وہ علم کی بنیاد پر حرکت کا تعین کر سکیں۔ لیکن غیر معینہ حرکت کو وہ بھی کسی نہ کسی مفروضہ سے حل کرتے ہیں۔ وہ حرکتِ تضاد ہو یا حرکتِ تشل۔ حرکتِ اتصال ہو یا حرکتِ انفعال۔

اسی بنا پر مولانا ہندوستان میں اس دور میں ولی اللّٰہی تحریک کا جو باقاعدہ ایک فلسفہ پر مبنی ہے، مقام متعین کرنا چاہتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ آج سابقہ حرکات کے مقامات بدل چکے ہیں۔ پہلے تحریک کا منشا ایک آزاد ریاست کا قیام تھا۔ اور اس کے لیے لازماً کسی نہ کسی خارجی مقام کی تلاش تھی، اس واسطے کہ یہاں جس قوت سے ہم متصادم تھے، وہ زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ لیکن آج صورت یہ نہیں۔ آج ہندوستانی عوام کا ایک مخصوص طبقہ حصولِ اقتدار کی جدوجہد میں بڑے زوروں سے مصروف کار ہے۔ اور قدرت نے اسے اس امر پر مامور کر دیا ہے کہ وہ اپنے پیش رو کی جگہ لے کر آگے بڑھے۔ ہمیں اب اپنی ولی اللّٰہی تحریک کے مقاصد کی جو ہندوستانی عوام کی تحریک تھی، نئی تشریح کرنا ہے، تاکہ ہم اپنا ایک مقام متعین کر لیں۔ مولانا کانگریس کو سامراج دشمن تو مانتے تھے۔ مگر فرماتے تھے کہ آج کانگریسی قیادت جہاں سامراج دشمن ہے، وہاں وہ ہندی سرمایہ دوست بھی ہے۔ اور اس نئی تبدیلی نے جہاں اس کو مضبوط کیا ہے، وہاں اسے کمزور بھی کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ تمام ہندوستان کے عوام کی ترجمان تھی، اب وہ صرف ہندی سرمایہ دار کی ترجمان ہے۔ اور اس میں عوام کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ (یہی حال پاکستان میں اب مسلم لیگ کا ہے۔ مستفاد غلام)

مولانا ایک تحریک میں، اس کے عوامی پہلو پر بہت زور دیتے تھے۔ ایک تحریک میں

اگر عوام کا مفاد مقدم رہتا ہے۔ تو وہ عوامی تحریک ہے۔ ورنہ وہ اس طبقے کی تحریک ہو جاتی ہے، جسے اس میں سیادت حاصل ہو۔ صوبہ سرحد میں مولانا ایک طرف خدائی خدمت گار تحریک کے ہمدرد تھے۔ کیونکہ یہ اصلاً سامراج دشمن تحریک تھی۔ لیکن اس پر جس طرح زمیندار چھا گئے تھے، اور یہ ان کے جاگیردارانہ عزائم کی آلہ کار بن گئی تھی، اس کے مولانا مخالف تھے۔ مولانا ہندوستانی سوسائٹی کو اپنے سامنے رکھتے تھے۔ جو جاگیرداری اور نوآبادیاتی نظام کی مخلوط سی شکل تھی۔ اس میں ایک طرف انفرادیت پسندی حد سے زیادہ ہے۔ اور دوسری طرف سامراجی عزائم کی مخالفت کا بھی جذبہ ہے۔ مولانا اس پر بڑا زور دیتے تھے کہ ہمارا ملک جاگیرداری دور سے گزر رہا ہے اور ساتھ ہی مقامی سرمایہ بھی اب ابھر رہا ہے لیکن وہ بدیشی سرمائے کا حصہ بنتا جا رہا ہے۔ اور نئی ریاست سامراجی مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے بنائی جا رہی ہے۔ یعنی ہمارے ریاستی ڈھانچہ کی تشکیل یورپ کے ترقی یافتہ ملکوں کے نمونے پر ہے۔ اس لیے یہاں کی عوامی تحریکوں کو ایک ترقی یافتہ سامراجی مشینری سے مقابلہ کرنا ہے جو صحیح اور گہرے شعور اور علمی قابلیت کے بغیر ناممکن ہے۔ اس سلسلے میں مولانا اپنے ساتھیوں کو شاہ ولی اللہ کی تحریک کے تجربات سے آگاہ کراتے رہتے۔ اور اس تحریک کے رہنماؤں اور کارکنوں پر ہندوستان اور غیر ممالک میں جو کچھ گزری، غیر ممالک میں برطانی اثر و رسوخ اپنے مخالفوں کے خلاف کیسے کام کر رہا ہے اور کس طرح بعض مجاہدین کو برطانی محکمہ خارجہ کے جاسوسوں سے قتل کرا دیا گیا، وغیرہ وغیرہ۔ ان

سب باتوں پر روشنی ڈالسکے۔ مولانا فرماتے تھے کہ آج کل سرمایہ انفرادی نہیں رہا کہ وہ کسی فرد واحد کا سرمایہ ہو۔ بلکہ ایک گروہ یا خاندان کا سرمایہ ہوتا ہے۔ انفرادی سرمایہ اور اس نوع کے گروہی سرمایہ میں یہ فرق ہے کہ پہلا ایک فرد کو منافع دیتا ہے اور اس سے ایک مخصوص گروہ کو منافع ملتا ہے، جو بڑا یا اثمر اور ترقی یافتہ ہوتا ہے۔ لیکن یہی سرمایہ اگر ایک مخصوص گروہ کی تنظیم سے نکل کر عوامی تنظیمی شکل اختیار کرلے تو فرق صرف تقسیم منافع کا ہوگا نہ کہ صورت سرمایہ کا۔ ایک کمپنی کے حصہ داروں کو اپنی حدود کے اندر جمہوری تنظیم کا بھی حق پہنچتا ہے۔ اور اس طرح ایک گروہ جمہور کے سرمائے پر مسلط ہو جاتا ہے۔ یہ حال آج کل اکثر سرمایہ داروں کا ہے کہ وہ کمپنی کے کچھ حصے لے کر اس کے سارے سرمائے کو اپنی تحویل میں کر لیتے ہیں۔ اور دوسرے حصہ دار اُن پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے۔ ان حالات میں جمہوریت ختم ہو جاتی ہے۔ اب اگر سوسائٹی میں جمہوریت کا قیام چاہیے تو مخصوص گروہ کے خلاف عام سرمایہ کا اتحاد ضروری ہے۔ اور وہ صرف امداد باہمی اور باہمی اشتراک ہی سے ممکن ہے۔ یہی سرمایہ جمہوریت کی اساس ہوگا۔ اور اس پر تمام حصہ داروں کا علی المراتب برابر کا حق ہوگا۔ ابتدائے اسلام میں بیت المال کے ادارہ کا قیام صرف حکومت وقت کے مصارف کے لیے نہ تھا بلکہ ہر شخص کا اس پر اپنی ضروریات کے مطابق یکساں حق تھا۔ اس دور میں بیت المال شخصی تصرف سے بالا تھا۔ اور یہ صحیح معنوں میں پوری امت کا بیت المال تھا۔ غرض ابتدائے اسلام کی جمہوریت کا یہی اساس تھا۔ لیکن حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد یہ صورت بدل گئی، اور بنوامیہ نے بیت المال کو اپنی جاگیر

بنالیا۔ اور اس طرح وہ ان کے اقتدار کا وسیلہ بن گیا۔ اگر بیت المال کی تنظیم جمہوری رہتی۔ جمہور مسلمان اس کی آمد وخرچ سے باخبر رہتے۔ اور اس پر ان کا حق تسلیم کیا جاتا تو آج ملت اسلامیہ کی تاریخ دوسری ہوتی۔ بیت المال کی اسی حرص و آز نے بنو امیہ میں آمریت پیدا کر دی۔ وہ باہمی کش مکش اور سازشوں کا شکار ہو گئے اور آخر کار یہی چیز ان کی تباہی کا باعث بنی۔ اسی طرح اگر ہندوستان میں سرمایہ مشترکہ اداروں کی شکل میں ترقی کرے تو وہ جمہوریت کی بنیاد بن سکتا ہے لیکن اگر یہ باثر اور صاحب امتیاز اقلیت کے ہاتھ میں ترقی کرے گا تو یہ سرمایہ موجودہ برطانی سامراج کا دشمن تو ہو سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ عوام دوست بھی ہو۔ مولانا فرماتے تھے کہ یہی وجہ ہے کہ محکوم ملکوں میں سرمایہ دار آزادیٔ ملک کی تحریک میں انقلابی موڑ پر پہنچ کر آخر میں سامراج سے سمجھوتا کر لیتے ہیں کیونکہ ملک کی عوامی تحریک جب ایک خاص موڑ سے گزر جاتی ہے تو وہ صرف سامراج دشمن ہی نہیں رہتی بلکہ عوام دوست بھی ہو جاتی ہے۔ اس مرحلے پر مقامی سرمایہ دار قومی آزادی کی تحریک کے خلاف بدیشی سامراج سے سمجھوتا کی راہ تلاش کرتے ہیں۔ اور اس طرح وہ خود بھی ایک بڑے سامراجی ملک کے حصہ دار بن جاتے ہیں۔ اس موڑ پر عوام کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اس تبدیلی کے خطرے سے آگاہ رہیں۔

پارٹی کی تنظیم میں باہمی مشاورت کو مولانا بہت اہمیت دیتے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ آج کل کی اکثر کمیونسٹ پارٹیاں ایک مخصوص گروہ کی آمریت بن جاتی ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان مشین کے طور پر استعمال

ہوتا ہے، اگرچہ دعویٰ جمہوریت ہی کا رہتا ہے۔ اور اس طرح ایک انقلابی فلسفہ کو آہستہ آہستہ ردِّ انقلاب کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے۔ انسان کو جب بھی تقلید پر مجبور کیا گیا، انسانی ترقی کی اقدار کا خاتمہ ہو گیا۔ اجتہاد ہی انسانی زندگی کی ترقی کی بنیاد ہے۔ اور اجتہاد کا ملکہ دراصل غور و فکر سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر غور و فکر کو انسانی زندگی سے نکال دیا جائے تو باقی رہ ہی کیا جاتا ہے؟ اسی لیے مولانا پارٹی کے اندر آزادانہ بحث و تحمیص کو پارٹی کی زندگی قرار دیتے تھے۔ اور چھوٹے چھوٹے مسائل پر عام کسانوں سے تبادلہ خیال فرماتے تھے۔ ان کا ارشاد تھا کہ بعض دفعہ سچائی ایک فلاسفر کے مقابلے میں ایک عام آدمی کے قول کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ جب بھی کوئی انسانی گروہ یہ کہتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اور سمجھتا ہے وہ بالکل سچ ہے، تو یہ گروہ ہمیشہ کے لیے اپنے اوپر کائنات کو سمجھنے کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ اور غرورِ نفس میں مبتلا ہو کر اپنے لیے اخلاقی موت کے سامان مہیا کرتا ہے، جو آہستہ آہستہ حقیقی موت پر منتج ہو جاتی ہے۔ اور یہ اس لیے کہ معرفت تامہ اس دنیا میں ناممکن ہے۔ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ اعتراف کہ اے اللہ! میں آپ کو حق معرفت کے درجے میں نہیں پہچان سکا، خود اس حقیقت پر دال ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ پارٹی کے اندر بحث و مباحثہ سے حقیقت حال دریافت کی جائے۔

اس دور میں مولانا جہاد فی سبیل اللہ کے سب سے بڑے داعی تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ انسانیت کی اجتماعی بہتری اور بہتر اخلاق کا تصور، لفظ "اللہ" کے تصور میں ہے، جو دلالت کرتا ہے "جمیع کمالات" پر۔ اب اگر خیر اور حصولِ خیر ایک کمال ہے

تو کمال خیر کے لیے جہاد ضروری ہے۔ مولانا فرماتے تھے کہ جب انسانیت کے لیے خیر کا حصول لازمی ہے، محض ضرورت نہیں تو جو گروہ حصول خیر کے لیے ایک زمانے میں خیر کے حصول کا نظریہ پیش کرتا ہے اور اس پر عمل درآمد کراتا ہے، وہ گروہ قائد امت کہلاتا ہے۔ یہ گروہ تعداد میں قلیل ہوتا ہے لیکن ترجمانی کثیر کی کرتا ہے۔ اس لیے وہ انقلابی گروہ کہلاتا ہے۔ کیونکہ وہ ایسے فائدہ کے حصول کا داعی ہوتا ہے جو نوع انسانی کا فائدہ ہے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں گروہ مومنین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہی "مفلحون" کا گروہ ہے۔



ملکیت کا مفہوم

مولانا اشتراکی پارٹیوں کے قائل تھے اور وہ اس لیے کہ یہ پارٹیاں اپنی کوئی فلاسفی رکھتی ہیں۔ سرمایہ دار جماعتوں کے اندر انتشار کا سبب یہی ہے کہ وہ سوائے حصولِ اقتدار کے اپنے سامنے کوئی فلاسفی نہیں رکھتیں۔ چنانچہ حصولِ اقتدار کے بعد ان میں شکست و ریخت شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اشتراکی جماعتوں کے بارے میں وہ فرماتے تھے کہ وہ ایک پروگرام پر عامل ہونے کے باوجود آمریت کا شکار ہو جاتی ہیں، وجہ یہ ہے کہ طبقاتی آمریت پارٹی آمریت میں بدل جاتی ہے اور پارٹی آمریت شخصی آمریت کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کا اصل سبب ان پارٹیوں میں اخلاقی اقدار کے دوام کا فقدان ہے۔

مولانا فرماتے تھے کہ جماعت جب اس قسم کے رجحانات کا شکار ہو جاتی ہے تو وہ اپنے ان دوستوں کو بھی معاف نہیں کرتی، جو ایک منزل تک ساتھی رہ چکے ہوتے ہیں۔ یہ عمل دو طرف سے ہوتا ہے۔ ایک کامیاب گروہ کی طرف سے کہ وہ ناکام گروہ کے خلاف ہر قسم کے الزام تراشتا ہے۔ اور اپنے ہر سقیم عمل کو بھی صحیح بتاتا رہتا ہے۔ اور دوسرے ناکام گروہ کی طرف سے۔ اس کے افراد جب انسانی کمزوری کا شکار ہوتے ہیں تو وہ مخالف کیمپ میں چلے جاتے ہیں۔ اس کی ایسی تاریخ میں

بہت مثالیں ملتی ہیں۔ اس قسم کی ذہنیت کو ختم کرنے کے لیے مولانا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں سے یہ واقعہ پیش کیا کرتے تھے۔ مکہ پر فوج کشی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ آپؐ نے انھیں راز میں رکھنے کا حکم فرمایا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ایک صحابی حاطب بن ابی بلتعہ نے قریش مکہ کو ایک خط لکھا جس میں ان تیاریوں کا ذکر تھا۔ آنحضرت صلعم کو معلوم ہو گیا اور یہ خط راستے میں پکڑا گیا۔ حضرت حاطب نے اقبال جرم بھی کر لیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے ان کی گردن زدنی کی اجازت چاہی۔ حضورؐ نے فرمایا: "حاطب بدری ہے عمرؓ!" یعنی ایک سابقہ اچھا عمل بعد کے غلط اعمال کی معافی کا سبب ہو سکتا ہے۔ اور اس بارے میں اپنی جو مجبوریاں اس صحابی نے بیان کیں، وہ قبول کر لی گئیں۔ مولانا تحریک کے ساتھیوں کی کوتاہیوں سے جب تک کہ وہ ردِّ انقلاب کی حد تک نہ ہوں، درگزر کرنے کا فتویٰ دیتے تھے۔ اور یہ مشورہ وہ انوارِ مشکوٰۃ نبوّت ہی سے مستفید ہو کر دے سکتے تھے۔ مادی دنیا میں اس قسم کی معافیوں کی مثال کم ملتی ہے۔ مولانا کا ارشاد تھا کہ اشتراکیت اپنے اسی دیتیرے سے اپنے لیے تباہی کا سامان کرے گی۔ اور یہ اس لیے کہ وہ صرف مادی اثرات کے تحت فیصلے کرتی ہے۔ اور اپنے ہر مخالف کو ردِّ انقلاب کے کیمپ کا مؤید سمجھ لیتی ہے۔

مولانا، شاہ ولی اللہ اور ان کے پیرو کاروں کی فلاسفی کو مانتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتے تھے کہ وہ بنیادی دعوت دے کر چلے گئے۔ اب ہمارا کام ہے کہ دعوت کی تجدید حالات اور مقتضیات وقت کے مطابق کریں۔ شاہ صاحب نے ہندوستان میں شخصی حکومت کے زوال کے بعد عوامی حکومت کے

قیام کے لیے جد وجہد کی، جو ناکام ہوئی۔ یہ ایک الگ بحث ہے۔ اب جو ہندوستان میں عوامی حکومت بنے گی، اس کی شکل اور طریقہ کار مختلف ہوگا۔ یہ انقلاب عوام کو اپنی قوت سے لانا ہوگا، اور اس کا طریق ہندوستانی ہوگا۔ یہ مخصوص کیفیات کا حامل ہوگا، جو جماعت اپنے اپنے ادوار میں متعین کرتی رہے گی۔ مولانا پارٹی کے طریق کار میں اپنے پیش رو حضرات کی تقلید فرماتے تھے۔ یعنی وہ ایک جمہوری مرکزیت کے جو دراصل لامرکزیت کے مترادف ہوتی ہے، قائل تھے۔ وہ مختلف اداروں میں مرکزی خیال کے تو حامی تھے لیکن نظم وضبط میں وہ کسی جامد مرکزیت کے قائل نہ تھے۔ مثال کے طور پر وہ ان مدرسہ جات کی مثال دیتے جیسے سہارن پور، دہلی، دیوبند، گنگوہ وغیرہ۔ جن میں مرکزی خیال ایک ہے لیکن تنظیمی علحدگی موجود ہے۔ وہ اس قسم کی تنظیم کی ایک خوبی یہ بتاتے تھے کہ اگر ایک حصہ خدانخواستہ کسی مرض کا شکار ہو جائے تو لازمی نہیں کہ دیگر حصص بھی اس سے متاثر ہوں۔ اس طرح اصلی مرکزی خیال زندہ اور فعال رہتا ہے۔ مولانا مشاورت مجلسی کے بڑے حامی تھے، لیکن مرکزی قیادت کو ایک فیصلہ کن حیثیت دیتے تھے۔ کیونکہ مرکز میں اطلاعات زیادہ ہوتی ہیں اور یہ سب کی سب عوام کو معلوم نہیں ہوتیں۔ لیکن عوامی رجحانات کا پتہ عوامی جد وجہد اور عوامی بحث وتحیص ہی سے لگ سکتا ہے۔ اپنے اس نقطۂ نظر کی تائید میں مولانا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ کرام کی مختلف مجالس مشاورت کی مثالیں دیتے تھے۔

مولانا فرماتے تھے کہ مادّی فلسفہ اور اخلاقی فلسفہ دونوں "کلام الناس" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں میں سچائی کا ایک نہ ایک پہلو ضرور ہوتا ہے۔ لیکن ان

دونوں کا مجموع تصور بھی مکمل نہیں کیونکہ کائنات کا مکمل علم ابھی دونوں کو نہیں۔ نورِ نبوت سے اگر استفادہ نہ ہو تو دونوں سے نجات مشکل ہے۔ مولانا اخلاقی فلسفہ میں کشف کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ لیکن فرماتے تھے کہ وحدت الوجود یا وحدت الشہود دونوں میں باوجود اختلاف کے ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ کہ یہ سب کشوف عالم کے بارے میں ہیں اور یہ نفسِ انسانی ہی کے مظہر ہیں۔ ان کا ظہور تصورِ انسانی ہی میں ہوتا ہے، جو خود حادث ہے۔ اور حدوث اور قِدم کا ارتباط محال ہے۔ چنانچہ یہ کشف ہر حال میں نورِ نبوت کی تشریح کا محتاج ہے۔ اور نورِ نبوت کا منشا تکمیلِ مکارمِ اخلاق ہوتا ہے۔ اگر آج انسان کو تباہی سے بچانا ہے تو تکمیلِ مکارمِ اخلاق پر سب سے زیادہ زور دینا چاہیے۔ ورنہ علم اور تہذیب کا یہ سارا گورکھ دھندا زمین پر آ رہے گا۔ باہمی آویزش انسان کو ہمیشہ تباہی کی طرف لے جائے گی اور سکونِ قلب، جو انسان کی حقیقی خواہش ہے مفقود رہے گا۔ مولانا بنیادی طور پر فلسفۂ شاہ ولی اللہ کے قائل تھے۔ اور اس میں ان کا درجہ ایک مجتہد کا تھا۔ مولانا فرماتے تھے کہ فلسفہ دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ فلسفہ عمرانی اور فلسفہ مذہبی۔ وہ عمرانیات میں ہمیشہ جدید علوم کی تحقیق پر زور دیتے تھے۔ فلسفۂ مذہبی میں وہ ہمیشہ کشفِ علمی یا کشفِ وجدانی پر زور دیتے تھے۔ لیکن وہ کشوف جو نورِ نبوت کے مخالف ہوں، انھیں وہ مردود جانتے تھے۔ مولانا فرماتے تھے کہ کشف علم کا ذریعہ ہو سکتا ہے لیکن وہ التباس سے خالی نہیں ہو سکتا۔ کشف ایک خبر کی حیثیت رکھتا ہے جو احتمالِ کذب و صدق کی حامل ہوتی ہے۔ استصداق اسی وقت کہا جائے گا جب یہ نبوت کے حقائق کے موافق ہو گا اور اس سے متصادم نہ ہو گا۔ لیکن عمرانی فلسفہ میں

مولانا یہ قید نہیں لگاتے تھے۔ اور فرماتے تھے۔ یہ انسانی تجربات کے ماتحت ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ کی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"معلوم ہونا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مرویات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق تبلیغ رسالت سے ہے۔ اور دوسری وہ جن کا تبلیغ رسالت سے کوئی تعلق نہیں ہوا کرتا۔ اس قسم کے امور کے متعلق آپ نے فرمایا: "میں ایک انسان ہوں۔ جب میں دین کے بارے میں تمہیں کوئی حکم کردوں تو اسے پکڑ لو۔ اور اس کی تعمیل کرو۔ اور جب میں اپنی رائے سے کسی دنیوی شے کے متعلق حکم کہوں تو میں ایک انسان ہوں۔ اور آنحضرت صلعم نے درخت خرما کے گابھا لگانے کے متعلق جب کہ کھجور اس سال کم آئی، فرمایا تھا: میں نے صرف گمان اور خیال سے کہا تھا اور ظن و تخمین کے بارے میں تم میری پیروی نہ کیا کرو۔ البتہ جب میں کوئی بات اللہ تعالیٰ کی جانب سے پیش کردوں تو تم اس کی پیروی کرو کیونکہ میں اللہ پر جھوٹ نہیں بولتا۔ طب اور علاج کا حصہ بھی اسی قسم میں داخل ہے۔"

مولانا فرماتے تھے کہ زمین اور اس کے سارے متعلقات انسانی نفع کے لیے قدرت نے پیدا کیے ہیں "متاع لکم ولانعامکم"۔ یہ عام ہے اس "متاع" میں کفر اور ایمان کی کوئی قید نہیں ہے۔ قدرت نے سب کو برابر کا حصہ دار بنایا ہے قرن اول میں قیام بیت المال ایک جمہوری مقصد کے لیے تھا۔ اور ہر شخص کا اس پر حق تھا۔ حضرت عمرؓ نے غیر مسلموں کے حق کو اس پر تسلیم کر کے اس ادارہ کو اور جمہوری بنایا۔ اور اس میں حضرت علیؓ اور اکابر صحابہ کا مشورہ شامل تھا۔

بے شک زمین سب کے لیے "متاع" کا حکم رکھتی ہے لیکن اس متاع میں تصرف کے لیے تقدیم اور تنظیم لازمی ہے۔ مولانا فرماتے تھے میرے نزدیک زمین کی مثال مسجد کی سی ہے کہ ہر مسلمان کا اس میں حق ہے۔ لیکن جو مسلمان پہلے آتا ہے اور ایک جگہ پر بیٹھ جاتا ہے، وہ اس جگہ کا مالک اور متصرف ہے۔ جب تک کہ وہ خود خوشی سے اس جگہ کو نہ چھوڑ دے۔

مولانا زمین کے استعمال میں اباحت عامہ اس حدیث سے مستنبط کرتے تھے جس میں آیا ہے کہ اگر تمہارے پاس زمین ہے تو اس کو یا خود کاشت کرو یا اپنے بھائی کو مفت کاشت کے لیے دے دو۔ فرماتے تھے کہ حدیث کے الفاظ "ان کان لکم الارض" میں لکم کی ضمیر سے متاع تقدیم کا پتہ چلتا ہے۔ یعنی زمین کی نسبت تمہاری طرف کر دی گئی ہے۔

مولانا کے نزدیک آج کی زمینداری اور جاگیرداری کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس بارے میں، فرماتے تھے۔ میں زمیندار کا حق استعمال فائق مانتا ہوں بشرطیکہ وہ خود کاشت کرے۔ ورنہ وہی صورت باقی رہ جاتی ہے جو حدیث میں مذکور ہے۔ میں بے کار زمینداروں اور جاگیرداروں سے کہوں گا کہ ظلم نہ کریں۔ اس ظلم سے روک کر دراصل میں ان کی مدد کرنا چاہتا ہوں کہ وہ دوزخ میں نہ جائیں۔ میں ان کا حقیقی دوست ہوں۔ لیکن افسوس وہ بے سمجھ ہیں۔ میں ان کو اکل حلال کی دعوت دیتا ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ میری دعوت مظلوم کسانوں کے لیے بھی ہے۔ کہ وہ بیدار ہو کر اس ظلم کو روکیں، جس میں وہ بھی مدد دے رہے ہیں، اور ظلم کرنے والے گروہ کو جو دوزخ کے کنارے پر کھڑا ہے، دوزخ سے

بچائیں۔

زمین میں اس کے مالک کو جو تصرف کا حق حاصل ہے، مولانا اسے بھی مشروط مانتے تھے۔ جو اشیا مثلاً پانی، خود رُو گھاس وغیرہ جن میں انسانی محنت کو دخل نہیں، مولانا انھیں عامۃ الناس کے لیے مباح قرار دیتے تھے۔ اور اس میں کسی ریاستی یا سماجی حکم کو جو اس کی تحدید کرے، جائز نہیں خیال کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ متصرف کی میراث بھی صرف تصرف زمین میں ہے، ملکیت میں نہیں۔

مادی دینی فلسفہ

عمرانیات کے سلسلے میں مولانا حضرت شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کی تشریح یوں فرماتے تھے۔ کائنات میں بقائے باہمی اور فنائے باہمی کا عمل بیک وقت جاری ہے۔ اشیا ایک دوسرے سے مل کر ایک نئی شے پیدا کر رہی ہیں، اور اس کے ساتھ ساتھ اشیا ایک دوسرے کے خلاف عمل پیرا ہو کر ایک دوسرے کو فنا کر رہی ہیں۔ اب اگر غور کیا جائے تو جن دو یا دو سے زیادہ اشیا کے اغراض مشترک ہوں، وہ بقائے باہمی کے تحت اپنی اور دوسری کی حفاظت کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اسی طرح جن دو اشیا کے مفاد باہم متصادم ہیں، وہ ایک دوسرے کو فنا کرنے کی درپے ہیں۔ اس تضاد اور اجتماع سے دنیا کی زندگی ہے۔ اور یہی راز حیات کائنات ہے۔ دو برابر کی قومیں باہمی صلح کے لیے کوشاں ہیں۔ کیونکہ تصادم میں دونوں کی تباہی کا خطرہ ہے۔ لیکن کمزور کو زیادہ طاقتور بلا خوف ہضم کرنے کی فکر میں ہے۔ یہی حال افراد اور حکومتوں کا ہے۔

ایک خاندان کے افراد میں جب تک مقاصد مشترک ہوں گے باہم اتفاق رہے گا۔ جس دن مقاصد مشترک نہ ہوں گے وہ الگ الگ اپنی راہ نکال لیں گے۔ اسی طرح سوسائٹی میں اغراض کے اشتراک سے سوسائٹی کا قیام اور اغراض کے عدم اشتراک

سے اس سوسائٹی کا منتشر ہونا لازمی ہے۔ اسی نظریہ کے تحت مولانا اشتراکی سوسائٹی کو زیادہ پائیدار مانتے تھے۔ کیونکہ اس سوسائٹی میں تقریباً ایک جیسے مفاد افراد کے ہوتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ قسم کے سماج میں ہمیشہ مفاد کا تضاد رہا ہے اور رہتا ہے۔ اس لیے ان گروہوں میں باہم تصادم ناگزیر ہے۔ اس کے برعکس اشتراکیت ہمیشہ ایسی سوسائٹی کے قیام کی داعی رہی ہے جو افراد کے لیے متاع حیات کے ایک جیسے مواقع مہیا کرے۔ اسی وجہ سے مولانا اشتراکی لوگوں کے دوست تھے۔ لیکن آج کی اشتراکیت سے اپنا وہ الگ ذہن رکھتے تھے۔ اور یہ نتیجہ تھا اس فرق کا جو ایک مادی لادینی فلسفہ اور ایک مادی دینی فلسفہ میں ہے۔ مولانا شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کو ایک مادی اور دینی فلسفہ مانتے تھے۔ لیکن وہ جامد مذہبی فلسفہ کے مخالف تھے جو کہ کائنات کے زندہ اور فعال اعمال سے عاری ہو۔ اسی بنا پر وہ ہمیشہ اپنے ہم عصر علماء کے مطاعن کا ہدف بنے رہے۔ اور اسی طرح دیگر سیاسی گروہ بھی ان کو اپنا نہ سکے۔ بقول اقبال:

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

مولانا کے نزدیک زندگی کا اصل مقصد جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ وہ داعی الی الخیر ہونے کے مدعی تھے۔ اور قیام حدود شرعی کو واجبات انسانی مانتے تھے، "ضرورت" نہ سمجھتے تھے۔ مولانا فرماتے تھے کہ جہاد فی سبیل اللہ فرض عین بھی ہے اور فرض کفایہ بھی۔ یہ فرض عین اس وقت ہوتا ہے، جب طاغوتی قوتیں انسانی رشد و ہدایت اور فلاح و بہبود پر حملہ کریں۔ اس حالت میں ہر شخص پر جہاد فرض ہوتا ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے جہاز اگر طوفان میں پھنس کر تباہی کی طرف جا رہا ہو تو ہر ایک کا فرض ہوتا ہے کہ اسے تباہی سے بچانے کے لیے جدوجہد کرے۔ لیکن اگر ایسی نازک صورت نہ ہو تو صرف ایک گروہ اس فریضہ کی ادائیگی میں مصروف رہے۔ اور وہ ادائیگی سب کی جانب سے کافی ہوگی۔

رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا امام الامت ہونا من حیث المنصب تھا۔ یعنی اس لیے کہ آپؐ نبی تھے۔ آپؐ کی اس امامت کی بنا وحی یعنی خدا کی طرف سے تھی۔ لیکن بعد میں جب وحی کا دروازہ بند ہوگیا، یہ امامت از روئے وحی نہ رہی بلکہ یہ امت کا فرض ٹھہرا کہ ان میں جو اعلم بالکتاب والسنۃ ہو اس کا انتخاب کیا جائے۔ چنانچہ قبل از انتخاب امام کی اطاعت واجب نہیں۔ لیکن بعد از انتخاب واجب ہو جاتی ہے۔ پھر اگر امیر ادائیگی فرض میں کوتاہی کرے تو امت کے ہر فرد کا حق ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے امیر کی رہنمائی کرے۔ اور اگر امیر ارتکاب معاصی کی دعوت دے تو اس دعوت کو رد کرنا واجب ہے۔

مولانا فرماتے تھے: مسلمانوں کی ہر قوت حاکمہ اسلامی ریاست نہ تھی بلکہ صرف ان صفات سے متصف قوت حاکمہ اسلامی ہو سکتی ہے، جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر منتج ہوں۔ قرآن میں اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت کے بعد اولی الامر کی اطاعت کا جو حکم ہے تو اس اولی الامر سے یہی اسلامی ریاست مراد ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک ڈاکو بھی ایک گھر پر قبضہ کر کے گھر والوں کو مغلوب کر سکتا ہے۔ اور کیا یہ اطاعت واجب ہوگی؟ اسی طرح ڈاکوؤں کا ایک گروہ ایک علاقہ یا خطہ پر قبضہ کر کے لوگوں کو دعوت اطاعت دے سکتا ہے۔ کیا اس کی اطاعت

واجب ہے؟ ظاہر ہے نہیں۔ عمل کے لیے علم صحیح شرط ہے۔ اور عمل صحیح، علم صحیح کے بغیر ممکن نہیں۔ آپ فرماتے تھے کہ علم مجرد جوہر نہیں ہے بلکہ اس کے لیے عمل کے آثار کا تصور اور اس کے نتائج کا احاطہ ضروری ہے۔ چنانچہ ہر تبدیلی کے لیے علم صحیح اور عمل صحیح کا اتحاد ضروری ہوتا ہے۔ نہ تو عمل بغیر علم کے کوئی چیز ہے اور نہ علم بغیر عمل کے کچھ ہے۔ وہ عمل اضطراری ہوتا ہے، جو شعور اور علم کے بغیر ہو۔ انقلاب کسی اضطراری عمل سے نہیں ہوسکتا۔ وہ اجتماعی شعور اور مثبت فکر کی بنا پر ہوتا ہے۔ اور جب کوئی قوتِ حاکمہ پیش آئندہ مسائل کو حل کرنے میں ناکام رہتی ہے تو قدرت دوسری قوتوں کو اس امر پر مامور کرتی ہے کہ وہ اس فرض کو پورا کریں۔ یہ قوتیں اسی قوت حاکمہ کے بطن سے پیدا ہوتی ہیں۔

مولانا انقلاب کو انسانی فعل اور انسانی زندگی کا جزو مانتے تھے۔ انقلاب خواہ سماجی ہو خواہ نفسی، وہ انسانی افعال ہوتے ہیں۔ انسان کے افعال کے لیے کسی نہ کسی فلسفہ کی ضرورت ہوتی ہے اور انسانی زندگی کا یہ لازمہ ہے۔ یہ فلسفہ زمان اور مکان کے ساتھ تبدیلی قبول کرتا ہے لیکن انسانی زندگی کی بعض اقدار اضافی طور پر غیر مبدل ہیں۔ کیونکہ اگر ہم یہ نہ مانیں تو پھر انسانیت کے وجود میں تسلسل برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے، اور کسی اجتماعی عمل کی صحت اور غلطی کی جانچ پڑتال مشکل ہو جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا حصولِ خیر کی جد و جہد کی قدر کو تمام اقوام اور ادیان میں مشترک مانتے تھے۔ اسی طرح تصورِ خیر کو بھی عمل اور اہم کا فکری اثاثہ قرار دیتے تھے۔ نیکی اور بدی کا تصور بذات خود ایک قدر ہے۔ اگرچہ اضافی طور پر اس کے مفہوم میں فرق ہوتا رہتا ہے۔ اور یہ نتیجہ ہوتا ہے

شعور عامہ میں اختلاف زمان ومکان کی رو سے تبدیلیوں کا۔ جب عوام ایک عمل کو اچھا سمجھ کر بطور شعار کے قبول کر لیں تو وہ ان کے ہاں نیکی بن جاتی ہے۔ یہ حقیقتاً نیکی ہوتی ہے۔ یہ الگ بحث ہے۔ اب اس نیکی یا بدی کے مفہوم کو تبدیل کرانے کے لیے عوام کے شعور میں تبدیلی لازمی ہے۔ مختلف اقوام اور ملل میں نیکی اور بدی کے قانونی ضوابط میں جو فرق پایا جاتا ہے اس کی یہی وجہ ہے جب تک عوام کے شعور کی گہرائیوں میں نیکی کے مروجہ تصور کے مفہوم کو تبدیل کرنے کی ضرورت کا عام احساس پیدا نہ ہو، انقلاب کامیاب نہیں ہوا کرتا۔ چنانچہ جب تک عوام موجودہ سماج کے رشتوں کی تقدیس کے خلاف متحد ہو کر شعوری طور پر آمادۂ عمل نہ ہوں، انقلاب بروئے کار نہیں آسکتا۔ مامورین خواہ وہ افراد ہوں، یا جماعت، اس فریضہ کے لیے مامور ہوتے ہیں، کہ وہ اس شعور اور عملی تبدیلی کے لیے ذہن تیار کر کے امت کو اجتماعی عمل کی دعوت دیں۔ قرآن حکیم کی اصطلاح میں اس شعور کی تبدیلی کو "رُشد" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں ردِ انقلاب یا جامد حالت کو "غیّ" کہا گیا ہے۔ اور قرآن حکیم نے اپنی دعوت کو "تبین الرشد من الغیّ" بتا کر صاف اعلان کر دیا ہے کہ ان میں سے جو چاہے، رشد اختیار کرے اور جو چاہے غیّ میں مبتلا رہے۔ انبیائے کرام کو یہ مقامِ رُشد وحی کی بنیاد پر حاصل ہوتا ہے۔ صلحا کو عمل اور فکر کے مجاہدے سے، جس کی بنیاد علم صحیح ہوتی ہے۔ صحابہ کا مجاہدۂ عمل وفکر خارجی علم پر مبنی تھا۔ یعنی حضورؐ کی ذات موجود تھی جو اس علمِ خارجی کا سرچشمہ تھی۔ اور پیش آمدہ مسائل آپؐ کی زیرِ ہدایت حل ہوتے تھے۔ یہی آپؐ کا اسوۂ حسنہ ہے۔ لیکن آپؐ کے

وصال کے بعد یہ مقام محض تقلید سے نہیں بلکہ اجتہاد سے حاصل ہو سکتا ہے۔
اسی اجتہاد کی بنا پر امت میں مختلف مکاتب فکر پیدا ہوئے اور انھوں نے مسائل کے حل کے لیے مختلف راستے اختیار کیے۔ انسانی علم بلکہ سارے انسانی علوم قابل جرح ہیں۔ کیونکہ وہ انسانی خبر پر مبنی ہیں، جو کذب اور صدق دونوں احتمالی پہلو رکھتی ہے۔ مولانا فرماتے تھے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ علم انسانی کو اسی نگاہ سے دیکھے۔ اور تجربہ اور عمل کی روشنی میں اس کی صحت کی برابر جانچ پڑتال کرتا رہے۔ اسلامی تاریخ میں بعض چیزیں بطور "رخصت" اور بعض بطور پہلے سے موجود ہوتے کے تسلیم کی گئیں۔ انھیں اصل سمجھ کر امت نے الصراط المستقیم سے انحراف کیا۔ اب امت کو نئے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اس سارے علمی و دینی سرمائے کا جائزہ لینا ہوگا۔ اٹھارہویں صدی میں قدرت نے شاہ ولی اللہ کو مامور کیا تھا کہ وہ اس بارے میں ہماری رہنمائی کریں۔ اور بتائیں کہ دین حق کے بنیادی اصول و قواعد کیا ہیں، اور "رخصت" اور پہلے سے چلے آنے والے شعائر کے تحت کیا کیا چیزیں تسلیم کر لی گئی تھیں۔ شاہ صاحب نے اپنا یہ فرض ادا کیا۔ اب امت کے مفکرین کا کام ہے کہ وہ اس فکر ولی اللہی کی اساس پر ہمارے آج کے سماج میں جن تبدیلیوں کا ہونا ناگزیر ہو گیا ہے، ان کی طرف عوام کے دلوں کو مائل کریں اور سماجی انقلاب کو ممکن بنائیں۔

مولانا فرماتے تھے کہ تبدیلی تخلیقی نہیں ہوتی بلکہ تکوینی ہوتی ہے، اور "لا تبدیل لخلق اللہ" کا منشا یہی ہے۔ اگر یہ تبدیلی ممکن نہ ہوتی تو بعثت انبیا اور وجود صلحا ایک بیکار امر ہو جاتا۔ اور اگر تبدیلی تخلیقی ہوتی تو قدرت

بے کار محض رہ جاتی۔ غرض تبدیلی تکوینی اور اضافی ہوتی ہے۔ اور "خیارکم فی الجاهلية خیارکم فی الاسلام" اسی حقیقت پر دال ہے۔ یہ تبدیلی خیر میں نہیں ہوتی۔ اضافتِ خیر میں ہوتی ہے۔ پہلے جو خیر کفر کے حق میں استعمال ہوتا تھا بعد میں اسلام کے حق میں استعمال ہونے لگا۔ جو نسلی، قومی اور قبائلی عصبیت اسلام کے خلاف بروئے کار آتی تھی، وہ اب اسلام کے حق میں کام آنے لگی۔ یہی انقلاب امت تھا اور اسلام کا یہی معجزہ ہے۔ اس تبدیلی نے عرب کی سرزمین میں کوئی نئی چیز تخلیق نہیں کی۔ صرف قوتوں کے استعمال کی اضافت میں تبدیلی پیدا کر دی۔ اسی طرح آج ہمارے تمام سماجی رشتوں میں اضافی تبدیلی ممکن ہے، اور اسی کے لیے جدو جہد کرنا جہاد فی سبیل اللہ ہے، اور صالحین امت کی بعثت کا بھی منشا یہی ہوتا ہے۔ مجدد، مجتہد کامل اور مجتہد فی المذاہب وغیرہ تمام افراد اسی اضافت کی تبدیلی کے لیے مامور ہوتے ہیں۔ وہ خواہ جماعت کی شکل میں ہوں، خواہ افراد کی شکل میں ان کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ خیر کی اضافت میں تبدیلی کریں اور سماجی رشتوں کو فلاح انسانی کے لیے بروئے کار لائیں جو مرورِ زمانہ سے "غثی" کی صورت اختیار کر چکے ہوتے ہیں۔ اسی مقام پر فائز ہونے کو مولانا "مقام عبودیت" پر فائز ہونا کہتے تھے اور فرماتے تھے کہ جہاں جہاں انبیا نے اس فریضہ کو ادا کیا اور "فساد فی الارض" کو رفع کرنے کی کوشش کی وہاں ان کو قرآن مجید میں "عبدنا" کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔

ایک نکتہ۔ مولانا فرماتے تھے کہ مجھے کئی سال تک تردد رہا کہ جب بنی اسرائیل

میں کفر و طغیان کا زور ہوا تو جن لوگوں کو ان کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا، وہ بخت نصر کا لشکر تھا۔ لیکن اس لشکرِ کفر کو اللہ تعالیٰ نے "عباد لنا" کہہ کر ان کی طرف عبدیت کی نسبت فرمائی۔ فرماتے تھے کہ یہ نکتہ مجھ پر قیامِ حرم کے دوران کھلا کہ کفار بھی اگر رفعِ فساد کا کام کریں اور اس پر مامور ہوں تو وہ بھی عبودیت نسبتی یا اضافی سے سرفراز ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے قرآنی خطاب میں ان کے لیے "عبدنا" کی بجائے "عباد لنا" فرمایا گیا۔

اس پر اگر پوری طرح غور کیا جائے تو پتہ چل سکتا ہے کہ مولانا کس قسم کی دعوت کے حامل تھے۔

مولانا فرماتے تھے کہ جب میں انقلابِ امم کو اضافی تبدیلی یا تکوینی تبدیلی کہتا ہوں تو اس سے یہ امر صاف ہو جاتا ہے کہ اصل شئے میں تبدیلی یا انقلاب نہیں ہوتا۔ جو جماعت انقلاب کی داعی ہو گی وہ باہر سے نہیں آئے گی۔ وہ ہماری طرح کے انسان ہوں گے۔ صرف ان کی اور ہماری نسبت انسانیت میں تبدیلی ہوئی ہو گی۔ مولانا فرماتے تھے کہ اسی لیے میں ہر انقلابی جماعت کے لیے مخصوص انقلابی اخلاقی اقدار کا قائل ہوں۔ جو لوگ اخلاق اور اخلاقی اقدار کے قائل نہیں، میں خیال کرتا ہوں کہ وہ ایک فساد سے دوسرے فساد کو رفع کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے ایک تبدیلی تو ہو سکتی ہے لیکن انقلابِ امم نہیں ہو سکتا۔

مولانا فرماتے تھے۔ میں انقلاب سے پہلے دعوتِ انقلاب کی تعیین کو ضروری خیال کرتا ہوں۔ وہ حضورؐ کی اس دعوت کو بطور استدلال پیش کرتے تھے، جو قرآن حکیم میں اس طرح مذکور ہے کہ میں تو تم کو جنت کی دعوت دیتا ہوں اور

تم مجھے آگ (دوزخ) کی دعوت دیتے ہو۔ مولانا کے نزدیک انقلابی جماعت کے پاس ایک انقلابی پروگرام کا ہونا لازمی ہے، جس کی طرف وہ قلوب کو مائل کرے۔ جب قلوب میں یہ تبدیلی ہو جاتی ہے اور لوگ منزلِ مقصود کو صاف طور پہ دیکھ لیتے ہیں تو پھر ان کے پاؤں میں لغزشیں نہیں ہوتیں۔ حضورؐ کی دعوت رفعِ فساد اور قیامِ امن کے لیے تھی اور وہ اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی تھی کہ ایک صحت مند سماج کے قیام کی دعوت دی جائے اور مظلوم کو ظلم سے نجات دلائی جائے۔ اسی وجہ سے اسلام کی دعوت کو شروع میں عرب کے غریب طبقات نے قبول کیا اور مفادِ خصوصی نے اس کی سخت مخالفت کی۔

مولانا فرماتے تھے کہ میں حیران ہوں کہ ہمارے بعض علما اسلام کو کس طرح شخصی املاک کا محافظ قرار دیتے ہیں۔ اگر یہ ہوتا تو عرب کے مفادِ خصوصی کو کیا پڑی تھی کہ وہ اسلام کی دعوت پر حضورؐ کے جانی دشمن ہو جاتے۔ یقیناً اسلام محنت سے کمائی ہوئی دولت کو شخصی ملکیت قرار دیتا ہے۔ اس کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہے۔ اور سارق اور قطاع الطریق کے لیے سخت سزائیں تجویز کرتا ہے، لیکن جس دولت کو حرام اور غیر شرعی طریق سے حاصل کیا گیا ہو اسلام اس کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں۔ وہ حقوق العباد کو حقوق اللہ کے برابر خیال کرتا ہے۔ دونوں کو پورا کرنے کی برابر دعوت دیتا ہے۔ اور اس میں حاکم اور محکوم کی تمیز کو روا نہیں رکھتا۔

مولانا فرماتے تھے کہ مخلوق کا کوئی سماجی رشتہ مقدس نہیں۔ جب وہ امن عالم سے متصادم ہو تو وہ بدلا جانا چاہیے۔ لیکن ایک وجود ایسا ہے جو کسی تبدیلی

یا اضافی تبدیلی کو قبول نہیں کرتا۔ وہ ذات باری تعالیٰ ہے جو خیر ہے اور تمام خیر اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ خالق خیر ہے، اس لیے وہاں تبدیلی نہیں ہوتی۔ نہ ہو سکتی ہے۔ یہی وحدت الوجود کا تصور میں پیش کرتا ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب

مولانا کے نزدیک وحدت الوجود ایک ایسا نظریہ ہے جو زمان اور مکان سے بے نیاز ہے۔ وہ کسی قوم یا ملک یا خطے کا نظریہ نہیں۔ وہ کسی ایک مذہب کا بھی نظریہ نہیں، بلکہ تمام امم اور ملکوں کا یکساں نظریہ ہے۔ تمام قوموں کو اس نظریہ پر جمع کر کے خیر کے حصول کے طریق پر متفق کیا جا سکتا ہے۔ اور یہی انقلاب اہم ہے جس کے لیے شاہ ولی اللہ اور ان کی جماعت دعوت دیتی تھی۔ اور اب میں بھی اسی کا داعی ہوں۔

اس دعوت وحدت الوجود سے وہ کثرت اور وحدت کے مسئلے کا حل نکالتے تھے۔ فرماتے تھے کہ حق و باطل کے لیے کثرت و وحدت کی بھی شرط نہیں۔ ذات حق واحد ہے بلکہ نسبت توحید سے بھی بری ہے۔ اور وہ خیر اور حق محض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں قرآن حکیم کی قبل از ہجرت مکہ کی دعوت کو جسے قلیل گروہ نے قبول کیا تھا، اسی طرح حق مانتا ہوں جس طرح کہ جب کثیر گروہ نے اسے قبول کیا، اس کو حق مانتا ہوں۔ حق اس اضافت و نسبت سے حق ہے کہ وہ حصول خیر کا داعی ہے۔ اور اس کے خلاف باطل کی دعوت باطل ہے۔ خواہ وہ کثرت کی طرف سے ہو یا قلت کی طرف سے۔ اور کثرت و قلت سے حق و باطل کی نشاندہی کرنا ٹھیک نہیں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ حق معلوم کرنے کے لیے امت کو مسلسل جد و جہد کرنا ہو گی۔ جو قوم اور ملت تلاشی حق سے

غافل ہو گئی، اور اپنے آپ کو ہی حق پر سمجھ بیٹھی، وہ آہستہ آہستہ حالت "غیّ" میں مبتلا ہو جائے گی۔ اور شیطان کی سب سے بڑی خطا یہی تھی کہ اس نے اپنے علم کو کافی سمجھ کر خلقِ آدم کی علت کو سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ جو قوم اپنے علم کو کسی حالت میں بھی کافی سمجھے، وہ انحطاط میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس لیے انقلابی جماعت کا فرض ہو گا کہ وہ مسلسل دعوتِ فکر اور دعوتِ عمل دیتی رہے اور کائنات کے رازوں کی تلاش کرتی رہے۔ یہی مقصودِ "عبودیت" ہے۔ اور جو قوم یا ملت اس پر قائم ہو گی، وہی ناجی امت ہے۔ وہی مفلحین کا گروہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔



منظوم کلام

مولانا کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ ان کے کچھ اشعار مجھے یاد رہ گئے وہ یہاں دیے جاتے ہیں:

دل کو فدائے غمزہ کہوں یا ادا کہوں
حیراں ہوں میں کہ کیا کہوں اب اور کیا کہوں

سب کہہ دیا رقیب ہی نے جان کنی کا حال
بے مرفہ ہے کہ میں بھی یہی ماجرا کہوں

اب تک تو اپنا دل ہی نہ قابو میں رکھ سکا
تم ہی کہو کہ غیر کو میں کیا برا کہوں

کیا کم ہے تیری ذرہ نوازی یہی کہ میں
جب پوچھتا ہوں حال تو کہتے ہیں کیا کہوں

زاہد تو رات دن پیے چھپ چھپ کے خم کے خم
اور میری سادگی کہ اُسے پارسا کہوں

دورِ قدح وہ چاہیے ساقی کہ دم بدم
اک جام لے کے ہاتھ میں ایک اور لا کہوں

بات کیا ہے اگر آج ہوگئے ہم برباد — کیا کوئی اہل جنوں دہر میں آباد بھی ہے

یہ شعر مولانا نے ہری پور جیل میں کہا تھا، جب کہ مولانا کو ڈاکٹر خانصاحب کی وزارت میں غلّہ ڈھیری کی تحریک کے سلسلے میں عدالت میں پابجولاں پیش کیا گیا تھا:

اسیری نے سکھایا شیوۂ وابستگی مجھ کو میری زنجیر کے حلقے بھی آپس میں ملے آئے

ہر ایک ہے اب ہوا و ہوس کی آماجگاہ
مسجد ہے دیر ہے کہ رواق نشست ہے
حرفِ غلط تھا لوحِ جہاں پہ جو مٹ گیا
بس مختصر غلام کی یہ سرگزشت ہے

ہم نفس تاریک ہو جب شامِ غم
دل کے داغوں کو جلا لینا دیئے
کس طرح ہو دل کے زخموں کا رفو
ہائے یہ اب تک کسی نے بھی سیئے؟

ہم نے کھولی جو زندگی کی کتاب عشق ہی باب باب میں دیکھا

بھول جائے گا جہاں منصور کو ہند نے داس اور بھگت پیدا کیے

نہ جائیں گے یہ خونِ ناحق کے داغ اگر آب کوثر سے دھو لیجیے

مولانا کی وفات پر

سرحد کے سیاسی لیڈروں کے تعزیتی بیانات

[یہ تعزیتی بیانات مولانا عبدالرحیم صاحب پوپلزئی کی وفات پر سرحد کے اخبار "رائے عامہ" میں چھپے - عمر فاروق]

سردار عبدالرب نشتر

مجھے مولانا عبدالرحیم مرحوم سے نیاز مندی کا شرف حاصل رہا۔ اس لیے مجھے ان کی زندگی کو قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ مولانا مرحوم ایک جید عالم، ایک متوکل انسان اور ایک سمجھ دار سیاسی راہ نما تھے۔ اگرچہ عمر میں وہ کئی دیگر علمائے سرحد سے کم تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی حیثیت علمی حلقوں میں اتنی بلند تھی کہ انھیں بلا چون و چرا مفتی اعظم تسلیم کیا جاتا تھا۔ توکل کی یہ کیفیت تھی کہ انھیں اکثر مالی و دیگر مشکلات درپیش رہتی تھیں۔ لیکن انھوں نے راضی برضائے الٰہی ہو کر کبھی اُف تک نہیں کی۔ اور ہنسی خوشی ہر مصیبت کا مقابلہ کیا۔ سیاسی طور پر وہ سرمایہ دارانہ نظام کے شدید ترین مخالفین میں سے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھیں نہ صرف انگریزی بلکہ کانگریسی عہد حکومت میں بھی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ وہ اپنی ذاتی صفات اور بے لوث خدمات کی وجہ سے عوام میں نہایت عزت کی نظر سے دیکھے

جاتے تھے۔ جب کبھی غریبوں کی خدمت کا موقع آیا وہ باوجود خرابیٔ صحت صفِ اوّل میں نظر آتے تھے۔ اس بار بار قید اور اس بدسلوکی کی وجہ سے جو دورانِ قید میں ان کے ساتھ کی گئی، ان کی صحت بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں ان پر تپ محرقہ کا حملہ ہوا تو وہ اس کو برداشت نہ کر سکے۔ ان کے مرضِ موت میں جب کبھی مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا، ان کی گفتگو سے یہی ٹپکتا تھا۔ کہ انھیں بچنے کی کوئی امید نہیں۔ چنانچہ بالآخر انھیں داعیٔ اجل کو لبیک کہنا پڑا۔ حضرت مولانا کی وفات سے صوبہ سرحد کے علمی اور سیاسی حلقوں میں ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے کہ اسے پُر نہیں کیا جا سکتا۔ آج وہ ہم میں نہیں لیکن ان کی زندگی ہمارے لیے اور آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے گی۔ آج کی دنیا پروپیگنڈا کی دنیا ہے، اور مولانا مرحوم اس رنگ سے قطعاً ناآشنا تھے۔ لیکن وہ وقت دور نہیں کہ لوگ ان کی خدمات کی اصلی قدر و قیمت سے آگاہ ہوں گے ؎

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

خان عبدالقیوم خان بار ایٹ لا

مولانا عبدالرحیم صاحب مرحوم و مغفور جنگِ آزادیٔ ہند کے ایک بہادر سپاہی تھے۔ آپ ایک قابلِ قدر پاک مسلمان اور بلا تمثیل فرقہ پرستی سے آزاد انسان تھے۔ آپ نے صحیح معنوں میں اسلامی بُردباری پر عمل کیا اور اپنی اخلاص و محبت ہر نوعِ انسان کے لیے بلا امتیاز مذہب و ملت

وقف کی۔ زندگی بھر میدانِ حریت میں پیش قدم رہے۔ مسلسل قید و بند اور برطانوی اسیری کے مصائب خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے۔ ہماری موجودہ اور آئندہ نسل آپ کے نقشِ قدم پر چلنے کے لیے ہمہ تن کوشاں رہے گی۔

حکیم عبد الجلیل ندوی۔ پشاور

مولانا عبد الرحیم صاحب مرحوم و مغفور صوبۂ سرحد کے ان بے لوث راہ نماؤں میں سے تھے، جو قوم کی خدمت اپنا فرض سمجھ کر کرتے تھے۔ اور کسی نام و نمود، عزت و جاہ اور شہرت کی خواہش نہیں رکھتے تھے۔ ان کی تمام زندگی اسی اخلاص و صداقت کا نمونہ تھی۔ اور وہ آخر تک اپنی اسی روش پر قائم رہے۔ مولانا کا استغنا بھی اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ انھوں نے ہمیشہ اور ہر حال میں قناعت کا دامن تھامے رکھا۔ وہ خود غریب تھے اور غریبوں کی تکالیف کو دور کرنے میں کوشاں رہے۔ نوجوانانِ سرحد کو ان کے نقشِ قدم پر چل کر ان کی یاد کو تازہ رکھنا چاہیے۔

کامریڈ محمد یونس۔ پشاور

مفتیٔ سرحد، شیرِ حریت مولانا کی موت سے جو حادثہ سرحد کی سیاسیات میں رونما ہوا، اس کی تلافی مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ مولانا نظری طور پر کارل مارکس کے سماجی انقلاب کے سائنٹفک سوشلزم کے نظریہ کے قائل تھے۔ اور چاہتے تھے کہ ہندوستان کے محنت کش عوام کو ان کی اپنی طبقاتی قیادت میں منظم کیا جائے تاکہ محنت کش عوام ملک کی آزادی سے صحیح طور پر بہرہ اندوز

ہو سکیں - سرحدی سیاست میں مولانا برطانوی سامراج کے لیے ہمیشہ پُر اسرار شخصیت رہے - اسی واسطے ان پر متعدد مقدمات چلا کر ان کو قید و بند کی صعوبتیں پہنچائی گئیں - آپ ہند میں سوشلسٹ کیمپ میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے - اکثر اختلاف کی صورت میں آپ کی طرف رجوع کیا جاتا تھا - علاوہ بڑے لیڈران کے آپ کارکنان میں بے حد عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے - کیونکہ آپ بالکل عوامی ڈھنگ سے ان میں رہتے تھے - آپ ایک بلند پایہ انقلابی شاعر اور ادیب ہونے کے ساتھ ماہر تاریخ، فلاسفر اور فقیہہ تھے - آپ کو اس لیے سقراط سرحد مانا جاتا تھا - آپ جب بھی کسی قومی یا بین الاقوامی مسئلہ پر گفتگو فرماتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ معلومات کا چشمہ پھوٹ نکلا ہے -

ملک امیر عالم بی - اے جامعہ (ایڈیٹر ترجمان سرحد)

حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب سے میرا تعلق صرف میدان سیاست میں رہا - مرحوم کی سیاسی اصابت رائے کا علم مجھے پہلی بار ۱۹۲۹ء میں ہوا جب مجھے پنجاب پراونشل نوجوان بھارت سبھا کانفرنس امرتسر کی صدارت اور خطبۂ صدارت پر ممدوح کا ایک خط ملا - مجھے معلوم ہوا کہ مولانا کی سیاسی بصیرت عام ہندوستان کے سیاسی راہ نماؤں سے بہت زیادہ ہے - اس کے بعد مجھے مولانا سے واسطہ ہزارہ کی کسان تحریک میں پڑا - آپ کے ولولۂ عمل، بے نظیر سرگرمی اور اثر و رسوخ کا نتیجہ تھا کہ مانسہرہ کے موروثی مزارعان کی تحریک صوبہ کی عظیم ترین تحریک بن گئی - ضلع کی ہر دو ضلع کانفرنس بمقام مانسہرہ اور سرائے صالح بے حد کامیاب ثابت ہوئیں - لاکھوں مزارعین میں اس

بیداری کا پیدا ہونا ان دو کانفرنسوں کا صرف نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ اس تحریک کی قیادت کے لیے قدرت نے مفتی سرحد مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کو، جن کی زندگی کا مقصد اور لب لباب ہی کسان ایسے مظلوم طبقوں کی خدمت کرنا تھا، منتخب کیا تھا۔ مرحوم نے خوانین کی قتل، زدوکوب اور بے عزتی کی دھمکیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مستقل خوانین کے علاقوں کا، جہاں ان کے مزارعین بے حد دبے ہوئے تھے، کاغان و کوتلش کے دروں کے مسلسل دورے کامریڈ عمر فاروق کے ہمراہ شروع کیے۔ ہزارہ کی شدید برفانی سردی، مقامات کی بے پناہ بلندی، سواری کا فقدان اور خوانین کے خطرناک ارادے ان میں سے کوئی بھی آپ کو ان کاموں کی تکمیل سے مانع نہ آسکا۔ آپ کے کوہ شکن عزم اور ملکوتی ارادے اور سنجیدگی کے سامنے تمام مشکلیں ہیچ تھیں۔ مانسہرہ کی بارش، سردی اور برف باری آپ کے پروگرام کو نہ بدل سکی۔ اور قابل فخر کمال یہ کہ سفر کی صعوبتوں کے باوجود آپ نے سخت سے سخت سردی میں بھی تہجد کی نماز قضا نہیں کی۔ ہزارہ کی کسان تحریک میں محنت، مرحوم کی مظلوموں کی آزادی کے لیے تڑپ، غریب دوستی، خلوص اور سرگرمیٔ عمل کا، ناممکن تھا کہ آپ کے دبلے پتلے بدن پر اثر نہ پڑے۔ چنانچہ ان تمام امور سے آپ کی صحت کمزور ہوئی اور مولانا پر بیماری کا حملہ مہلک ثابت ہوا۔ مولانا کی موت سے صوبہ سرحد کی سیاست میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کو پر کرنے کی مستقبل قریب میں کوئی امید نہیں۔

محمد امیر صاحب۔ یکہ توت پشاور

دنیا میں ہمیشہ لوگ مرتے ہیں اور مخلوق مرنے ہی کے لیے پیدا ہوئی ہے

لیکن بعض مرنے والوں پر تمام قوم خون کے آنسو بہاتی ہے۔ ایسی ہستیوں میں سے ایک ہستی صوبہ سرحد کے مفتی اعظم، مجاہدوں کے امام، اپنے زمانے کے شیخ اکبر اپنے عصر کے بخاری، مولانا عبدالرحیم تھے۔ آپ حکومت برطانیہ کے ظلم و ستم کے مقابلہ میں ہمیشہ سینہ سپر رہے۔ آنے والی نسلیں اگر آپ کے پیغام پر عمل کریں تو امن، سلامتی، مکمل مساوات کا نظام نافذ کر سکتی ہیں۔ مولانا کے مخالفین ہمیشہ ان کی ہر قسم کی مخالفت کرتے رہے لیکن یہ مرد مجاہد ہمیشہ حضورؐ کے اس قول کے پیش نظر "لا تثریب علیکم الیوم" کا مکمل ترین نمونہ پیش کرتے رہے مصیبتوں اور آزمائشوں نے آپ پر حملہ کیا لیکن وہ آپ کے پختہ ارادہ کو کبھی بھی متزلزل نہ کر سکیں حکومت کی ظالم مشینری ہر وقت آپ سے ٹکرائی لیکن ہر بار رسوا ہوئی۔ آپ نے اپنا پیغام نہایت دیانت سے تیغوں کے سائے میں بھی دیا۔ وہ یہ تھا۔ دنیا چین اور امن کی زندگی بسر کرے۔ ہندوستان کا سماجی نظام، معاشی اور اقتصادی خوش حالی کا کفیل ہو۔ عدل و انصاف کا دور دورہ ہو۔ ظلم اور استحصال کا استیصال ہو۔ نہ ظالم کی حمایت ہو اور نہ مظلوم کی حق تلفی۔

محمد اسحاق صاحب ندوی۔ پشاور

موجودہ دنیا میں جس قدر حوادثات انسانیت کو پیش آ رہے ہیں، ان سب میں قوموں کے عروج و زوال، ترقی و تنزل، تغیر و تبدل کے اسباب کو بڑا دخل ہے۔ ایسی قوم کی داستان بڑی دلچسپی سے سنی جاتی ہے، جو اپنی بلند ہمتی کے بعد فروتر زندگی پر مطمئن ہو گئی۔ اور یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کہ قوم اپنے خصائص اور امتیازات چھوڑ دیتی ہے۔ ایسے حالات میں اس کے افراد میں اجتماعی زندگی کے

سیلئے ترقی کی امنگ اور بلند مقاصد کے حصول کا احساس دلوں میں پژمردہ ہوجاتا ہے۔ مولانا عبدالرحیم کی زندگی کا تعلق اس پرآشوب دور سے ہے جس میں ہندوستانی قوم انگریزی استحکام کے نیچے کہیں کہیں آزادی کی کروٹیں لے رہی ہے۔ لیکن پوری قوم میں قومیت اور حریت پسندی کا کوئی اجتماعی تصور پیدا نہیں ہوا۔ زرا و نمایانِ قوم آزادیٔ فکر اور آزادیٔ جسم کی دعوت ضرور دے رہے ہیں لیکن کوئی باقاعدہ تصورِ آزادی ان کے پاس موجود نہیں۔ مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کی زندگی کا تذکرہ دراصل ہماری گزشتہ ایک صدی کی سیاسی زندگی کا تذکرہ ہے۔ مولانا کی زندگی کے اوراق دراصل ہماری تاریخی زندگی کے گوشہ پر حاوی ہیں جن کی فروگزاشتیں درحقیقت اپنی تاریخ کے ساتھ دراصل دانستہ طور پر تجاہل سے کسی طرح کم نہیں۔ مولانا نہ صرف اپنے علمی خاندان کے ورثہ کے حامل تھے بلکہ ہندوستان کی اکثر علمی درس گاہوں سے مولانا متعلق رہے۔ رامپور، مینڈو، دیوبند سے مولانا کا تعلق تحصیل علم کے سلسلہ میں رہا۔ مولانا بطور معلم کے دور دور تک مانے جاتے تھے۔ مولانا کو فلسفہ اور منطق میں خاص کمال حاصل تھا۔ فلسفی دلائل اور منطقی پیچیدگیاں نہایت سہل اسلوب میں واضح فرمایا کرتے تھے۔ کسی فلسفی یا منطقی کے بارے میں صرف اس قدر کہا جاسکتا ہے کہ اس کے ذہن کی رسا مشکل مسائل کا حل ہے۔ لیکن مولانا کا ذوق عمل اگر ایک طرف فلسفہ اور منطق و فقہ کی جزئیات اور احادیث کی اسانید کے ساتھ قائم تھا تو دوسری طرف بلاغت، علم ادب، شعروسخن کی سبز وادیوں تک بھی پہنچا ہوا تھا۔ مولانا سیاسی میدان میں ایک بہادر جرنیل تھے۔ اور سانحہ ۲۳ راپریل ۱۹۳۰ء

ہیں مولانا دیگر سرحدی راہ نماؤں کے ساتھ گرفتار ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں مولانا غلہ ڈھیر تحریک میں جیل گئے۔ ۱۹۳۹ء میں تین برس کے لیے آپ کو جیل میں ڈالا گیا۔ اور باقی تمام عمر غریب عوام کی تنظیم اور خدمت میں بسر کی۔

کامریڈ رام سرن نگینہ (صوبہ سرحد)

مولانا ہندوستان کے بہترین عالم، مایۂ ناز فاضل اور اشتراکی راہ نما تھے۔ آپ صحیح معنوں میں مزدوروں کے غم گسار، کسانوں کے ہمدرد، غریبوں کے ساتھی، نوجوانوں کے سردار، بے کسوں کے معاون، بنی نوع انسان کے خدمت گزار، مظلوموں کے شفیق تھے۔ آپ کی زندگی ملک اور ملت کے لیے وقف تھی۔ موصوف ایک شخص تھے جس کا بدل ناممکن ہے۔ ان کے اٹھ جانے سے آج سرحد میں علم و شرافت کا خزانہ اٹھ گیا۔ آج کشتیٔ جمہوریت کا ناخدا بحر قضا کے خوف ناک تھپیڑوں کا شکار ہو چکا ہے۔ مولانا مرحوم صوبہ سرحد میں وہ واحد شخصیت تھے جنھوں نے سرحد میں محنت کش طبقہ کی تکالیف کا احساس کر کے انھیں دور کرنے کی جدوجہد کی۔ سوشلزم کے بارے میں مولانا یوں فرماتے تھے۔ بنی نوع انسان کی بہبودی کا راز اشتراکی نظام کے قیام میں پنہاں ہے۔ جس نے سوشلزم کی بنیادی حقیقت کو جان لیا، وہ کامیاب ترین انسان ہے۔ کاش ہمارے ملک کے عوام اس حقیقت کو سمجھ لیں۔

بخشی فقیر چند وید (ایڈیٹر "رائے عامہ")

مولانا وہ مایۂ ناز ہستی تھی، جس پر ہندوستان بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ملک نے بے شمار مجاہد پیدا کیے، جنھوں نے اپنی زندگی اس جہاد میں خرچ کر دی۔ لیکن اس عالم باعمل نے جس طرح مصائب اور آلام اٹھا کر اشتراکیت کے قیام کی جدو جہد میں حصہ لیا، وہ شاید اس صوبہ میں انہی کا کام ہو سکتا ہے۔ آپ نے صوبۂ سرحد میں نوجوانوں میں آزادیٔ وطن کا صحیح جذبہ اور تڑپ پیدا کرنے کے لیے جمعیت نوجوانان سرحد میں شرکت فرمائی، جس میں فخر ہمند کامریڈ صنوبر حسین، کامریڈ عبدالغفور آتش، عبدالعزیز خوش باش، کامریڈ عبدالرحمان ریا، سید امیر بادشاہ شریک کار تھے۔ اس انجمن کا کام سرحد میں سوشلزم کا پرچار کرنا تھا۔ مولانا جنگ آزادی ہند میں مختلف مراحل پر پیش پیش رہے۔ جس کی مختصر تفصیل یہ ہے: ۱۹۲۸ء میں آپ صوبہ کانگریس کے ممبر بنے۔ آپ لاہور کانگریس میں بطور ممبر شریک ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں آپ کو پشاور کے واقعات اور دیگر تقاریر کی بنیاد پر تین مقدمات میں زیر دفعہ ۱۲۴ الف ۹ سال قید بامشقت کی سزا دے کر گجرات جیل بھیج دیا گیا۔ ۱۹۲۴ء میں مولانا کو کانپور سازش کیس میں گرفتار کیا گیا۔ لیکن عدم ثبوت کی وجہ سے جلدی رہا کیا گیا۔ اگست ۱۹۳۱ء کو سرکشن کی پھانسی کے سلسلہ میں ایک سال کی، ایک تقریر کی بنیاد پر سزا دی گئی۔ اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں ہری پور کیمپ میں نظر بند کر دیا گیا۔ نظر بندی سے رہائی کے بعد آپ حج کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ ۱۹۳۷ء میں کانگریس وزارت نے آپ کو غلہ ڈھیر تحریک میں کسانوں کی سرحد میں پہلی تحریک کے سلسلہ میں دو سال قید بامشقت کی سزا دی۔ ۱۹۴۰ء میں جنگ کے خلاف عوام کو منظم کرنے

کے سلسلہ میں بنوں اور دیگر اضلاع کی تقاریر کی بنیاد پر پانچ سال قید کی سزا دی گئی۔ مولانا ایک سامراج دشمن راہ نما تھے۔ ہمیشہ سامراج سے سمجھوتہ نہ کے مخالف رہے۔ مسلسل قید بند نے آپ کی صحت کو تباہ کر دیا۔ مولانا انسانی عظمت کے بلند ترین عامل راہ نما تھے۔ قومیت ہند کا صحیح عوامی جذبہ آپ کے دل میں موجزن تھا۔ ہندو، سکھ، عیسائی، مسلمان کی تمیز روا نہ رکھتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں ہندوستانی اشتراکی تھے۔ خودغرض مولویوں، نام نہاد قومی لیڈروں نے ان کو زندگی بھر اپنے خلاف نبرد آزما رکھا۔ مولانا کا پیغام کمزوروں، غلاموں اور انسانی سوسائٹی کے پس ماندہ طبقوں کے لیے حیات نو کا اثر رکھتا ہے۔

فتح چند نسیم (ڈیرہ اسماعیل خاں)

مولانا ایک روشن دماغ مدبّر، اعلیٰ پایہ کے سیاستدان، ایثار و اخلاص کے مجسمہ تھے۔ علم و فضیلت کے لحاظ سے آپ افق سرحد پر ضیا ریز نور پاش مہتاب تھے۔ آپ کی تقریریں تاثیر، دلکشی اور اعجاز تھا۔ مجھے مولانا مرحوم سے ڈیرہ اسماعیل خاں کی جیل میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا کے ذکر سے جب بھی محفل گرم ہوتی ہے تو گردن ان کی عظمت اور رفاقت کی وجہ سے جھک جاتی ہے۔ جس فرد بشر کو ان سے ملنے کا شرف حاصل ہوا، وہی ان کی طبع عالی اور ہر دلعزیزی کا مدح سرا نظر آیا۔ اور ان کے حق میں یہ شعر نکلتے ہیں ؎ کرتے ہیں قدر سارے پیر و جوان تیری — تعریف گونجتی ہے تا آسمان تیری

مولانا مرحوم کی موت پر میں صرف یہی کہوں گا ؎

آہ لیکن اب ہلاک درد مجبوری ہوں میں — آج وہ دن ہے کہ محو شکوۂ دوری ہوں میں

شعرائے سرحد کا خراجِ عقیدت

صوبہ سرحد کی حالتِ زار

کامریڈ رام سرن نگینہ

چھا رہی تھیں جب مصیبت کی گھٹائیں چار سُو
چل رہی تھیں جب خصومت کی ہوائیں چار سُو
جب غریبوں بے کسوں کا ہم نوا کوئی نہ تھا
جب کسانوں کا حقیقی راہ نما کوئی نہ تھا
بے اثر تھی جب غریبوں بے نواؤں کی فغاں
ہم نوا کوئی نہ تھا اور کوئی نہ تھا رازداں
خوابِ غفلت میں پڑا مدہوش تھا کرتی کساں
درسِ آزادی سے جب محروم تھا ہر نوجواں
مفلس و نادار تھے جب مبتلائے رنج و غم
ہو رہے تھے جب غریبوں پہ ظلم جور و ستم
جب نظر آتا نہ تھا سرحد میں کوئی سرخ پوش
ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتا تھا کوئی جب سرفروش
ایسے عالم میں ہوا پیدا حقیقی راہ نما

قید و بند رنج و مصائب میں ہوا وہ مبتلا
مشعلِ علم و صداقت لے کے ہاتھوں میں اٹھا
ہر جوان دیش کو پیغام آزادی دیا
ہے بجا تجھ کو امیرِ کارواں کہہ دیجیے
رہبرِ آزادیٔ ہندوستاں کہہ دیجیے
زیب دیتا ہے کہ فخرِ نوجواں کہہ دیجیے
ناخدائے کشتیٔ ہندوستاں کہہ دیجیے

مفتیٔ اعظم کی یاد میں

[یہ نظم سرحد کے مشہور قومی شاعر میلا رام شوق نے سنٹرل جیل پشاور میں
مولانا کی وفات پر لکھی]

کس کے غم میں آسماں ہے سوگوار
کس کے ماتم میں ہے عالم اشکبار
کس کے خرمن پر گری ہیں بجلیاں
کس کے غم میں رو رہی ہیں بدلیاں
کس لیے یہ نالہ و آہ و بکا
کیوں ہوا ہے محشرِ ماتم بپا
کون ہوا ہے راہیٔ ملکِ عدم
چھا رہا ہے کیوں غبارِ رنج و غم
کیوں ہجوم یاس ہے طاری ہوا
ماتمی کیوں ہے ہر اک چھوٹا بڑا
کس لیے جھنڈے ہوئے ہیں سرنگوں
کس کے غم میں حال ہے اپنا زبوں

شہر کا نقشہ ہے کیوں بدلا ہوا
کیوں چمن کا رنگ ہے پھیکا پڑا

بلبلیں ہیں آج کیوں نالہ کناں
قمریاں ہیں کس لیے محو فغاں

آج کیوں ہیں پھول مرجھائے ہوئے
کس کی فرقت میں ہیں کملائے ہوئے

کانِ خوبی معدنِ جود و سخا
مفتیٔ اعظم وہ مرد با صفا

سب کا مونس غم گسار و دوستاں
ہو گیا ملکِ عدم کو وہ رواں

اس کے ماتم میں ہیں سب نالہ کناں
شہر کے چھوٹے بڑے پیر و جواں

قومیت کا تھا دُرِ نایاب وہ
بے شبہ پُر نور تھا مہتاب وہ

اس کے تھے اوصاف کے سب مدح خواں
مرد و زن چھوٹے بڑے پیر و جواں

مفتیٔ سرحد کی یاد میں

— محمد وسیم سرحدی

فخرِ ملت فخرِ دیں فخرِ وطن عبد الرحیم
قائدِ احرار میدانِ سیاست کے زعیم

گو بظاہر دیکھنے میں تو نحیف و زار تھا
دشمنوں کے سامنے اک آہنی دیوار تھا

دلستاں تیرا وہ اندازِ تکلم یاد ہے
وہ لبوں پر دل کشا موجِ تبسم یاد ہے

مدتوں تو آشنا طوق و سلاسل سے رہا
تا بہ آخر بر سرِ پیکار باطل سے رہا

غیر کیا اپنے بھی تیرے درپئے آزار تھے
گلشنِ ہستی میں گویا گُل نہ تھے سب خار تھے

دوستوں سے تجھ پہ وہ برق و ستم کی بارشیں
دشمنوں پہ وہ ترے ابرِ کرم کی بارشیں

صوبۂ سرحد کے جانبازوں کو تجھ پہ ناز تھا
تیری جانبازی میں شیخ الہند کا انداز تھا

اک زمانہ ہو گیا مدہوشِ افیونِ فرنگ
تجھ پہ لیکن چل سکا ہرگز نہ افسونِ فرنگ

تجھ کو مزدوروں سے تھا انس اور کسانوں سے پیار
تو غریبوں کا تھا حامی اور مظلوموں کا یار

ایک تو لیلائے آزادی کا دیوانہ رہا
زندگی بھر شمعِ حریت کا پروانہ رہا

کشتیٔ ملت کو تو کچھ اس طرح کھیتا رہا
ہر نفس جامِ شہادت کے مزے لیتا رہا

یہ جہاں یہ جسم وجاں ارض وسما کچھ بھی نہ تھا
تیری نظروں میں خدا کے ماسوا کچھ بھی نہ تھا

سرفروش وشیر دل ضیغم جگر تیرے خطاب
تیرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب



مصنف کے خود نوشت حالاتِ زندگی

[مولانا عبدالرحیم پوپلزئی کی عظیم شخصیت کو صحیح معنوں میں سمجھنے میں مجھے اپنی علمی استعداد اور اپنے مخصوص سیاسی رجحان سے بڑی مدد ملی۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر میری طالب علمانہ اور سیاسی زندگی ان مراحل سے نہ گزرتی جن سے وہ گزری تو میں حضرت مولانا کو اس طرح کبھی نہ سمجھ سکتا، جس طرح میں انھیں سمجھا ہوں۔ مولانا عبدالرحیم صاحب پوپلزئی کے حالات زندگی اور ان کے افکار کا ایک خاکہ پیش کرنے کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنی طالب علمانہ و سیاسی زندگی کا اس کتاب کے پڑھنے والوں سے مختصراً تعارف کرا دوں۔ اصل کتاب میں ان سطور کے اضافہ کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ حضرت مولانا کی زندگی جس ماحول میں گزری، اسے سمجھنے میں یہ سطور ایک تاریخی پس منظر کا بھی کام دیں گی]

میری پیدائش مورخہ ۱۱ر جون ۱۹۱۱ء کو بمقام ملک پورہ، تحصیل مانسہرہ ضلع ہزارہ میں ہوئی۔ پانچ سال کی عمر میں مجھے ایک قریبی گاؤں شیرپور کے دیہاتی سکول میں داخل کیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں میرے والد غلام خاں ایک قبائلی جھگڑے میں میرے ننھیالی عزیزوں میں سے ایک کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔

میں ابھی تین سال کا تھا کہ والدہ وفات پا گئیں۔ اور میں اپنی دادی کے زیر سایہ پرورش پانے لگا۔ کوئی چھ سات سال کا تھا کہ دادی بھی اس جہان سے کوچ کر گئیں۔ میں نے جماعت چہارم کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ جماعت پنجم میں مجھے مانسہرہ مڈل سکول میں انگریزی تعلیم کے حصول کے لیے داخل کیا گیا۔ میرا خاندان اپنی مذہبی روایات کے لیے مشہور تھا اس لیے میں نے ابتدائی مذہبی تعلیم اپنے گاؤں میں مختلف دیہاتی اساتذہ سے مکمل کر لی تھی۔ بعد میں مانسہرہ سکول میں مولانا حمید الدین صاحب سے، جو ہمارے سکول میں عربی کے مدرس تھے اور مذہبی علوم کے ایک بلند پایہ مدرس تھے، میں نے استفادہ کیا۔

میری ہمشیرہ میرے چچا خان بہادر علی گوہر خان آف اگرور کے لڑکے محمد افضل خاں سے بیاہی ہوئی تھی۔ اور میرے چچا کی انگریزوں نے کالا ڈھاکہ کی مشہور لڑائی میں ایک انگریز کے قتل کی سازش کے الزام میں تمام جائداد ضبط کر کے اگرور وہیلی ریگولیشن کے تحت پہلے کانگڑہ اور پھر لاہور جلا وطن کر رکھا تھا۔ وہ قلعہ گوجر سنگھ لاہور میں ایک سکھ سوہن سنگھ نامی کے مکان میں رہا کرتے تھے۔ بعد میں ان کو حسن ابدال میں رہنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ میں ایک دفعہ سکول سے بھاگ کر اپنی ہمشیرہ کے پاس حسن ابدال بھی گیا۔

میں ریاضی اور سائنس میں ہمیشہ اول آیا کرتا تھا۔ حالانکہ مسلمانوں کے بارے میں عام طور پر مشہور تھا کہ وہ ہندوؤں کے مقابلہ میں ریاضی میں کمزور ہوتے ہیں۔ مجھے شروع ہی سے فلسفہ اور ریاضی سے لگاؤ رہا۔ مڈل کے امتحان سے

جب میں فارغ ہوا تو گھر میں اپنے استاد مولوی محمود احمد دیوبندی سے فقہ کی ابتدائی کتب پڑھیں۔ انھوں نے مجھے ابتدا ہی سے قدوری اور کنز کے بجائے امام محمدؒ کی تصانیف جامع صغیر وغیرہ پڑھائیں۔ جب میں مانسہرہ کے ہائی سکول میں داخل ہوا تو مجھے حافظ عبدالحمید صاحب ہیڈ ماسٹر اور حکیم بشیر حسین صاحب سیکنڈ ماسٹر سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ میں نے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ پھر میں اسلامیہ کالج پشاور میں داخل ہو گیا۔ جب کبھی میں کالج کی چھٹیوں میں گھر آتا تو حافظ عبدالحمید صاحب میرا تقرر بطور استاد عارضی طور پر مانسہرہ ہائی سکول میں کر دیتے۔ حافظ صاحب کے گھر میں تین تین نوکر تھے اس کے باوجود کھانے کا کچھ حصہ وہ خود پکاتے۔ اور اسی طرح مجھے بھی ہدایت کرتے کہ خود اپنا کام کرنا سیکھوں۔ وہ خود اپنے جوتے مرمت کرتے۔

میرا خاندان ایک سلسلہ سے حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید سے وابستہ تھا۔ میرے پردادا اجلال خاں، سر عبدالقیوم صاحبزادہ کے نانا حضرت صاحب آف کوٹہ سے بیعت تھے جو حضرت سید صاحب اور شاہ صاحب کے خاص خلفا میں سے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میرے دادا اور والد کی باقاعدہ کسی سے بیعت تھی یا نہیں، لیکن ان کی کتب جو بعد میں میرے زیر مطالعہ آئیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی اسی سلسلہ کے معتقد تھے۔ میرے بھائی کے زمانے میں یہ سلسلہ ترک ہو گیا۔ لیکن صاحبزادہ صاحب کے خاندان کے اکثر بزرگ میرے زمانے تک ملک پور تشریف لاتے رہے۔ اسی خاندان کے ایک بزرگ عیلٰی باجا سے میری

ملاقات بھی ہوئی۔ میں نے ان سے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی کتاب الصراط المستقیم کی مدد سے اس فرق کو سمجھا جو دیگر صوفیا سے شاہ صاحب کے طریق تصوف کو تمیز کرتا ہے۔ میں نے ایک نماز ان کے ہمراہ باجماعت پڑھی۔ مجھے جو لطف اس جماعت میں آیا، بعد میں کبھی نصیب نہیں ہوا۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں میں وقتاً فوقتاً مولوی محمود احمد صاحب دیوبندی سے جو حضرت شیخ الہند کے خاموش مگر جلیل القدر شاگرد تھے، دینی علوم کی تحصیل کرتا رہا۔ وہ تصوف و طریقت میں مولانا اشرف علی تھانوی سے فیض یافتہ تھے۔ اور تھانہ بھون کی خانقاہ امدادیہ میں کئی ماہ رہے تھے۔ انھوں نے مجھے تصوف اسلامی کی طرف راغب کیا۔ اور احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت کو زیر مطالعہ رکھنے کی ہدایت کی۔ ان سے میں نے قرآن حکیم کی تفسیر اور ترمذی شریف پڑھی۔ نیز صحیح مسلم اور دیگر کتب احادیث میں دوران مطالعہ جو مشکل مقامات آتے وہ ان سے سمجھے۔ مؤطا امام مالک میں نے مولوی عبدالرحمٰن سے جو سہارن پور کے جامع العلوم کے فارغ التحصیل تھے پڑھی۔ اصول الشاشی مولانا قمر علی صاحب مرحوم مجاہد آف گھنول سے پڑھی، جو اصول فقہ کو سمجھنے میں میری بڑی مددگار ثابت ہوئی۔ اس طرح میں نے گھر میں اسلامی علوم کی تحصیل کی۔ ان بزرگان باصفا کی صحبت کا اثر تھا کہ میں مادی فلسفہ پڑھنے کے باوجود لادینیت کے حملہ سے محفوظ رہا۔

اسلامیہ کالج میں جب میں فسٹ ایر میں داخل ہوا تو کالج کے ڈین مولانا قطب شاہ عباسی نے ہمیں درس قرآن دینا شروع کیا۔ انھوں نے ہمیں سورۂ فاتحہ کی تفسیر پڑھائی۔ میں اگرچہ گھر میں تفسیر پڑھ چکا تھا لیکن قبلہ ڈین صاحب

نے جب ام الکتاب کی تفسیر بیان کی تو مجھ پر کئی مقالات لکھے۔ میں نے ان سے
سراجی جو میراث کی ایک مشکل کتاب ہے، پڑھی۔ منطق اور فلسفۂ اسلامی کے
بعض رسائل بھی حضرت ڈین نے مجھے پڑھائے۔ حضرت ڈین کو ڈارون کے
نظریۂ ارتقاء پر پورا عبور تھا۔ انھوں نے وہ بھی مجھے پڑھایا۔ کالج کے مادّی اور
گمراہ ماحول میں حضرت ڈین میرے لیے ایک روشنی کا مینار ثابت ہوئے۔

گو سیاسی لحاظ سے کالج کے ماحول پر سرکاری اثر غالب تھا لیکن پروفیسر
تیمور صاحب کی موجودگی کی وجہ سے کالج کا ماحول کچھ نہ کچھ سیاسی رہا۔ میرا
بھی پروفیسر تیمور سے تعلق تھا۔ اس لیے میں پشاور کی کانگریس کمیٹی کی سرگرمیوں
سے دلچسپی لیتا رہا، اگرچہ میں عملی طور پر ان میں شریک نہ ہو سکتا تھا۔ اسلامیہ
کالج کے مربی سر عبدالقیوم صاحبزادہ برطانوی سامراج کے مستحکم ستون تھے۔
لیکن کالج یونین کے مباحثے کافی آزادانہ ہوتے تھے، اور طلبہ عام مسائل سے
کافی دلچسپی لیتے تھے۔ حکومتِ ہند نے امان اللہ خاں کی حکومت کے خلاف
سازش کی اور اس کے ردِّ عمل کے طور پر پشاور میں جو تحریک چلی، اس سے ہمارا کالج
بھی متاثر ہوا۔ بچہ سقہ کے خلاف جب سپہ سالار غازی نادر خاں پشاور تشریف
لائے تو طلبۂ اسلامیہ کالج کے ایک وفد نے ان کو ایک سپاس نامہ پیش کیا۔ اس
وفد کے ارکان میں ایک میں بھی تھا۔

۱۹۳۱ء میں جب عبدالغفار خاں نے ہمارے ضلع کا دورہ کیا تو میرا تمام
خاندان ان کے ساتھ سامراج دشمن محاذ میں شریک ہو گیا۔ اور میں بھی خدائی
خدمتگار تحریک کا ممبر بن گیا۔ ۱۹۳۲ء میں جب جارج گرفتھ نے خدائی خدمتگا

تحریک کے خلاف اقدام کیا تو مجھے مع تمام افرادِ خاندان کے گرفتار کر لیا گیا۔ اس دفعہ ضلع کے تمام سرکردہ سیاسی کارکنوں کو گرفتار کیا گیا تھا، جن میں پنڈت پرشوتم داس۔ حکیم عبدالسلام صاحب ہری پور۔ مولوی غلام ربانی لودھی ہرائے صالح۔ محمد حسین ہری پور۔ مولوی قمر علی گھنول۔ سلیمان فارسی ڈھوڈیال۔ محمد داؤد خان، میرے برادرِ اکبر۔ علی اصغر میرے دوسرے بھائی۔ اور غلام خان قصیر پور، قابلِ ذکر ہیں۔ مؤخرالذکر کو معافی مانگنے کی وجہ سے بعد میں رہا کر دیا گیا باقی حضرات کو چھ ماہ سے دو سال تک کی سزائیں دی گئیں۔ مولوی غلام ربانی لودھی عدمِ ثبوت کی وجہ سے بری ہو گئے۔ میرے خلاف چونکہ دوسرا مقدمہ تھا، اس لیے مجھے اور مولوی قمر علی صاحب کو چھوڑ کر باقی حضرات کو ہری پور جیل تبدیل کر دیا گیا۔ مولوی قمر علی صاحب کو میجر خیر الکھاٹ کے خلاف جو ایبٹ آباد جیل کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ اور پارسی تھے، شکایت تھی۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ ان کو بھی ہری پور جیل بھیج دیا جائے۔ یہ مطالبہ نہ مانا گیا تو انھوں نے بھوک ہڑتال کر دی۔ میں نے بھی ان کی حمایت میں بھوک ہڑتال کر دی۔ جس پر ہمیں تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ مجھے بھوک ہڑتال کا پہلی بار تجربہ ہوا۔ سولہ دن کے بعد جب ہمیں ہری پور جیل پہنچایا گیا تو میری حالت ناگفتہ بہ تھی۔ مجھے ٹھیک نظر نہیں آتا تھا۔ ہمیں یہاں بھی الگ سے جا کر بند کر دیا گیا۔ ڈاکٹر محمد عمر صاحب، جو جیل کے انچارج تھے، کالج کے زمانے میں میری ان سے واقفیت ہو چکی تھی۔ ان کے لڑکے میرے دوست تھے۔ ان کے گھر والوں سے میری سلام دعا تھی۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں بھوک ہڑتال ترک کر دوں ورنہ میری صحت مستقل طور پر تباہ ہو جائے گی۔ میں نے کہا اگر مولوی صاحب

بھوک ہڑتال ترک کر دیں گے تو میں بھی ترک کر دوں گا۔ ڈاکٹر محمد عمر صاحب کے کہنے پر میرے بھائی اور حکیم عبدالسلام صاحب نے ہمیں حکم دیا کہ ہم بھوک ہڑتال ترک کر دیں۔ چنانچہ ہم نے اس حکم کی تعمیل کی۔ میری صحت کافی خراب ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر محمد عمر صاحب نے بڑی ہمدردی سے میرا علاج کیا اور میری صحت بحال ہو گئی۔ یہیں میں نے مولانا عبدالرحیم صاحب پوپلزئی سے اشتراکی تحریک سے اپنی وابستگی کا اظہار کیا۔ مولانا نے مجھے شاہ ولی اللہ اور یورپ کے عمرانی فلسفہ کی طرف متوجہ کیا۔ بخشی فقیر چند وید، لام سرن نگینہ، غلام محمد خان لوند خوڑ، رب نواز خان سالارِ اعظم تحریک خدائی خدمتگاراں، اور عبیداللہ خان خلف الرشید ڈاکٹر خانصاحب وغیرہ حضرات سے یہیں واقفیت ہوئی۔ جیل میں بدامنی کی وجہ سے اسے فوج کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب حالات معمول پر آگئے تو میں نے مولانا قمر علی صاحب سے ترجمۂ قرآن حکیم شروع کیا۔ مولانا عبدالرحیم کو جیل سے باہر نکال کر نظر بند کر دیا اور ان سے ہمارا باقاعدہ تعلق ٹوٹ گیا۔ میں چھ ماہ قید کاٹ کر رہا ہو گیا تو دوسرے مقدمہ میں پھر چھ ماہ قید کر دیا گیا۔ جب چھ ماہ قید کاٹ کر رہا ہوا تو میری زندگی میں کافی فرق آچکا تھا۔ ہمارے علاقہ میں رسوم بد کے خلاف تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس تحریک کے بانی میرے استاد مولوی محمود احمد صاحب، مولوی غلام احمد صاحب شنگئی، مفتی محمد الیاس صاحب اور مولوی غلام غوث صاحب تھے۔ ان حضرات نے انجمن اصلاح الرسوم ہزارہ کے نام سے ایک تنظیم بنائی تھی۔ میں قید کے بعد اس انجمن میں شریک ہوا۔ ایک آزاد اسلامیہ مدرسہ بھی جاری کیا گیا تھا۔ میں انجمن کا جنرل سیکرٹری منتخب ہوا اور

مولوی غلام غوث صاحب آزاد مدرسہ کے صدر مدرس اور مولوی محمود احمد صاحب دوئم مدرس تھے۔ مولوی غلام غوث صاحب کے بعد مولوی محمود احمد صاحب اوّل مدرس ہوئے۔ اُن دنوں احمدی، آریہ اور عیسائی حضرات میں آپس میں خوب مباحثے ہوتے تھے۔ میں ان میں باقاعدہ شریک ہوتا تھا۔ اس سے مجھ میں وسعتِ نظر پیدا ہوئی۔ میں نے انجیل اور توراۃ کا خوب مطالعہ کیا۔ بلکہ ان کے بعض حوالہ جات مجھے ازبریاد تھے۔ میں نے ستیارتھ پرکاش کو کئی بار پڑھا۔ ویدوں اور گیتا کے انگریزی ترجمہ کو دیکھا۔ ویدانت فلاسفی کی انگریزی کتابیں پڑھیں۔ اس سلسلہ میں سوامی سیوانند کا میں شکر گزار ہوں کہ انھوں نے تمام لٹریچر میرے لیے مہیا کیا۔ میرے استاد اب بھی میرے لیے بڑے مددگار ثابت ہوئے۔ انھوں نے مجھے مولانا محمد قاسم کی کتب سے روشناس کرایا۔ مباحثہ شاہجہان پور، تقریر دلپذیر، اور قبلہ نما کی ہر دو جلد مطالعہ کے لیے دیں۔ اگرچہ قبلہ نما کے سمجھنے میں انھوں نے میری مدد کی لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اس کے بعض مقامات میرے لیے آج تک مشکل رہے ہیں۔ اس مطالعہ سے میری نظر بہت وسیع ہو گئی۔ مولوی محمود احمد صاحب نے مجھے حجۃ اللہ البالغہ پڑھنے کو دی اور اس کے سمجھنے میں مدد بھی کی۔ لیکن حجۃ اللہ البالغہ کی سیاسی احادیث کا پتہ صرف مولانا عبدالرحیم پوپلزئی ہی سے لگا۔

سیاست سے عملی دلچسپی کی وجہ سے میں نے مولانا عبدالرحیم کی زیر ہدایت مارکسیت کا مطالعہ شروع کیا۔ اور ان کی ہی بدولت میں پنجاب کے راولپنڈی والے نوجوان بھارت سبھا کے گروپ سے روشناس ہوا۔ اور مہاراج کرشن سے میں متعلق ہو گیا۔ آہستہ آہستہ میرا مارکسیت کا مطالعہ وسیع ہوتا گیا۔ اس

کی وجہ سے مجھے بعض لوگوں نے لادین بھی کہا، جن میں میرا خاندان بھی شریک تھا۔ اس دوران میں ہم نے مولانا عبدالرحیم کی زیر قیادت ضلع ہزارہ کی کسان تحریک میں کافی کام کیا۔ مولانا عبدالرحیم کی وجہ سے میں ماورائے سرحد بھی جاتا تھا۔ کل ہند کی بائیں بازو کی تحریکوں سے بھی میرا تعلق تھا۔ کسان سبھا کی کل ہند کمیٹی کا میں سرحد کی طرف سے ممبر تھا۔ ۱۹۳۵ء میں جب کمیونسٹ تحریک کی ابتدا باقاعدہ طور پر ہندوستان میں ہوئی تو صوبہ سرحد میں جتنا تعلق اس کا مولانا عبدالرحیم پوپلزئی سے تھا، میں اس میں تقریباً برابر کا شریک تھا۔ ۱۹۳۹ء میں جنگ کی وجہ سے آل انڈیا کانگریس میں جو دو گروہ بن گئے تھے ان میں سے سوبھاش چندر بوس کے گروہ میں ہم شامل ہو گئے۔ اور غلام محمد خاں لوندخوڑ، خوش حال خاں خٹک، اکبر شاہ (نوشہرہ)، محمد شاہ پکی، وغیرہ کے ساتھ میں بھی فارورڈ بلاک کی سرحد ورکنگ کمیٹی کا ممبر تھا۔ مولانا مرحوم فارورڈ بلاک کے باقاعدہ ممبر نہ تھے لیکن وہ ہمارے شریک کار ضرور رہے۔ مولانا مارکسیت اور تحریک ولی اللہ کے مادی پہلوؤں پر ہمیشہ روشنی ڈالتے تھے۔

سب سے پہلے میں نے گوجرانوالہ میں ایک لیبر کانفرنس میں تقریر کی۔ اس کی صدارت کے فرائض غلام محمد خاں لوندخوڑ نے ادا کیے۔ اسی کانفرنس میں میں کامریڈ فضل الٰہی قربان سے متعارف ہوا۔ یہ ان دنوں پنجاب کمیونسٹ پارٹی کے رکن تھے اور روپوش تھے۔ میری ان سے ایک کوٹھی میں ملاقات ہوئی اور مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال ہوا۔ میں کامریڈ موصوف کی بالغ النظری سے بہت متاثر ہوا اور اب تک متاثر ہوں۔ میری یہ تقریر ۱۹۳۹ء کے

اواخر میں ہوئی۔ مجھے ساتھیوں نے پولیس کی گرفتاری سے بچانے کی خاطر دوسرے دن صبح سویرے گوجرانوالہ سے دو سٹیشن آگے جا کر ایک بس میں سوار کرایا۔ ۱۹۴۰ء میں کانگریس کے رام گڑھ سیشن کے بعد محترم ساتھی عبدالرحمٰن خان تباہ اور کمل سرکار بنگالی کے توسط سے میں لیبر پارٹی آف انڈیا سے تعلق پیدا ہوا۔

میں نے اپنے کلکتہ کے قیام کے دوران مزدور تحریک کی عملی تنظیم کو دیکھا کسان تحریک کی تنظیم کا مجھے کافی تجربہ تھا۔ اب آہستہ آہستہ مجھے عوامی انقلاب کے عوامی طریقہ ہائے کار سے واقفیت حاصل ہوتی گئی۔ میں نے ۱۹۴۰ء میں راولپنڈی میں دو تقریریں کیں۔ ایک دیولی کیمپ کے بھوک ہڑتالیوں کے متعلق اور دوسری نومبر کے انقلاب روس کے بارے میں۔ ۱۹۴۱ء کی ابتدا میں کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی زیر قیادت پنجاب کے تمام بڑے شہروں میں کانفرنسیں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ پہلی کانفرنس گوجرانوالہ میں ہوئی، جس میں جھنڈا لہرانے کی رسم میں نے ادا کی۔ اس کانفرنس کی مجلس انتخاب مضامین کا بھی میں ممبر تھا۔

میں نے کانگریس سوشلسٹ دوستوں کے کمیونسٹ دشمن طریق کار کی مخالفت کی اور کانفرنس میں پیش کی جانے والی قراردادوں کو عام قومی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ اس سے سوشلسٹ دوستوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ میں کمیونسٹ پارٹی کی زیر ہدایت ان کی مخالفت کر رہا ہوں۔ حالانکہ یہ غلط تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ پنجاب کے کانگریس سوشلسٹ ہمیشہ کمیونسٹ دوست رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے کمیونسٹ دوستوں کے اجارہ دارانہ طرز عمل نے اپنے دوستوں کو بھی مخالف کیمپ میں دھکیل دیا۔

دوسرے دن کے اجلاس میں، میں نے جنگ کے خلاف تقریر کی۔
میری تقریر کافی تیز تھی۔ کامریڈ ستیا وتی دہلی نے میری تقریر کی تائید میں تقریر
کی۔ انھیں دوسرے دن راولپنڈی میں گرفتار کر لیا گیا۔ اور مجھے بعد میں گرفتار
کر کے راولپنڈی کی دو تقریروں کی بنا پر مجبور پر مقدمہ چلایا گیا اور دو سال
قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ راولپنڈی جیل میں ان دنوں دہلی اور پنجاب کے
مشہور سیاسی قیدی تھے۔ یہاں مجھے کئی سکھ راہ نما ملے جو پرانی غدر پارٹی کے
ممبر تھے۔ اور اب کرتی گروپ میں کام کرتے تھے۔ انھوں نے پنجاب کے
سابقہ انقلابیوں کی تاریخ سے واقف کرایا۔ نیز مجھے بتایا کہ کن کن لوگوں نے
کن کن وجوہ کی بنا پر پارٹی سے غداری کی۔ یہ میرے لیے ایک بڑا تاریخی سرمایہ
تھا۔ جیل میں ایک قیدی راؤ محمد حسن صاحب کرنال کی کلاس ضبطی کے سلسلہ میں
ہمارا جیل کے حکام سے اختلاف ہو گیا۔ راؤ صاحب فارورڈ بلاک ضلع کرنال
کے ممبر تھے اور جیل میں میرے واقف ہو گئے تھے۔ میں نے ان کی ضبطی کلاس
کے سلسلہ میں احتجاجاً اپنی بی کلاس چھوڑ دی۔ سپرنٹنڈنٹ جیل نے جو ایک ہندو
تھا، اور میرا اچھا خاصا واقف ہو گیا تھا، مجھے کہا کہ سرحد کے جیلوں کی حالت
اور ہے اور پنجاب کی اور، اس لیے میں کلاس ترک نہ کروں۔ لیکن میں نے مصمم
ارادہ کر لیا تھا کہ ایک ساتھی کی توہین کے بعد میرے لیے کلاس میں رہنا ٹھیک
نہیں۔ چنانچہ مجھے اس کے بعد سی کلاس دے کر لائل پور ڈسٹرکٹ جیل تبدیل
کر دیا گیا، اور راؤ محمد حسن کو فیروزپور جیل۔ لائل پور میں مجھے ایک ہفتہ تک
قید تنہائی میں رکھا گیا۔ اور اس احاطہ میں رکھا گیا، جہاں خطرناک قسم کے

قیدی تھے۔ لائل پور کی گرمی نے مجھ پر اثر کیا اور میں بیمار ہو گیا۔ ادھر پارٹی کے لوگوں کو میرے لائل پور تبدیل کیے جانے کا علم ہو گیا۔ اور ان کی کوششوں سے میرا طبی معائنہ کرایا گیا۔ پارٹی نے میری نگرانی ہائی کورٹ میں کی ہوئی تھی۔ ہائی کورٹ نے میری سزا گھٹا کر چھ ماہ کر دی۔ اس طرح لائل پور جیل میں میں صرف دو ماہ رہ کر رہا ہو گیا۔

۱۹۴۲ء میں میری پھر گرفتاری عمل میں آئی۔ اور حکومت سرحد نے مجھے چھ ماہ کے لیے نظر بند کر کے ہری پور جیل بھیج دیا۔ انہی دنوں فخر افاغنہ خان عبدالغفار خان بھی ہری پور جیل میں نظر بند تھے۔ ہمارا کچھ سپرنٹنڈنٹ جیل سے جھگڑا ہو گیا اور مجھے اور دوسرے احباب کو پشاور تبدیل کر دیا گیا۔ وہاں قاضی عطاء اللہ اور امیر محمد خان مردان وغیرہ پہلے سے نظر بند تھے۔ چونکہ کمیونسٹ پارٹی نے سوویٹ یونین پر ہٹلر کے حملے کے بعد عوامی جنگ کی لائن اختیار کر لی تھی اور اینٹی فاشسٹ محاذ میں شریک ہو گئی تھی۔ اس لیے حکومت نے مجھے چھ ماہ کے بعد مزید نظر بند نہ کیا اور رہا کر دیا۔ اس عرصہ میں مجھے بالشویک پارٹی کی پہلی کانگریس نے مرکزی کمیٹی کا متبادل ممبر منتخب کیا۔ بعد میں مجھے مرکزی کمیٹی کا باقاعدہ رکن منتخب کیا گیا۔

۱۹۴۴ء میں فسطائیت بطور ایک بین الاقوامی طاقت کے شکست کھا رہی تھی۔ لیکن ہمارا خیال تھا کہ اس موذی تصور کے خلاف عوامی جد وجہد کو جاری رکھنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے صوبہ سرحد میں دورہ کیا۔ اور لوگوں کو نئی صورت حال کے مقابلہ کی دعوت دی۔ ہم نے صوبہ سرحد میں پہلے پارٹی کی بنیاد رکھی جس کی پہلی

کانفرنس ہم نے بمقام تنگیاری کی۔ اس کی صدارت کے فرائض محترم اکبر شاہ ایم اے بنوچی نے سرانجام دیے۔ اس کانفرنس میں بالشویک پارٹی کے جنرل سیکریٹری کامریڈ شیشر رئے اور پیپلز فرنٹ اخبار کے ایڈیٹر پروده مکرجی نے شرکت کی۔ سرخپوش جماعت اور کمیونسٹ پارٹی دونوں نے ہماری مخالفت کی۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد خود خان عبدالغفار خان کو اسی نام کی جماعت بنانی پڑی۔ پیر صاحب مانکی شریف نے بعد میں اسی مقصد کے پیش نظر عوامی لیگ کی بنیاد رکھی۔ ہم نے دوران جنگ لوگوں کو راشن شدہ اشیا کنٹرول نرخوں پر مہیا کرانے کے لیے امداد باہمی کی تحریک پر زور دیا۔ اور بہت حد تک اس میں کامیاب رہے۔ بلیک مارکیٹ کرنے والوں نے ہمارے خلاف متحدہ محاذ قائم کیا۔ اور حکومت ہند اور حکومت سرحد کی دوغلا پالیسی بھی ان کی ممدومعاون ثابت ہوئی، لیکن ایک حد تک ہم عوام کو کنٹرول شدہ اشیاء مہیا کرانے میں کامیاب ہوئے۔ صوبہ سرحد میں کانگریس نے بعد از جنگ اپنی وزارت کے قیام کے بعد جب تجارتی سنڈیکیٹ قائم کیے اور اپنے مخصوص لوگوں کو تجارتی اجارہ داری سپرد کی تو ہم نے اپنی سوسائٹی کو مجبوراً ختم کیا۔ سرحد کے عوام جانتے ہیں کہ سرحد کانگریس کی اس پالیسی نے عوامی سطح پر سرخپوش تحریک کو کتنا نقصان پہنچایا۔ اب سرخپوش تحریک پر خان بہادروں اور رائے بہادروں کا قبضہ تھا۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں ہماری پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا اجلاس بمقام گوہاٹی (آسام) منعقد ہوا۔ اور اس میں ہند کے عوام کو ہندوستان کی غیر قدرتی تقسیم کے خلاف متنبہ کیا گیا۔ پارٹی نے اپنی قرارداد میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی مخالفت

کی۔ اور بائیں بازو کی پارٹیوں سے تعاون کی اپیل کی۔ کیمونسٹ پارٹی پاکستان کے مطالبہ کی تائید کر چکی تھی۔ وہ اس کو حق خود ارادیت کی بنا پر مان چکی اور اس نے سکھوں کے لیے سکھ ہوم لینڈ کا نعرہ بھی دیا تھا۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی، آل انڈیا کانگریس کی ہر بات کی تائید کرتی رہی۔ اور اگر اس نے پاکستان کے قیام کی مخالفت کی تو وہ ہندو مہا سبھا کے زیر اثر کی بہرحال ہماری پارٹی کی صدا، صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتیں کانگریس اور مسلم لیگ ملک کی تقسیم پر متفق ہو گئیں۔ کانگریس مسلم لیگ ملکی تقسیم کا بدلہ تقسیم بنگال و پنجاب کی شکل میں لینا چاہتی تھی۔ راجا جی کا فارمولا اسی بات کا پیش خیمہ تھا۔ ہم نے سلہٹ میں ریفرنڈم کا تماشا دیکھا۔ مونٹ بیٹن ایوارڈ نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کو اور زیادہ خراب کر دیا۔ میں اور کامریڈ عبد الرحمٰن جب لاہور پہنچے تو پنجاب میں فرقہ دارانہ فساد کی آگ پھیل چکی تھی اسی طرح سرحد بھی فساد کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ مانسہرہ کی آگ اور فسادو کو میں نے بچشم خود دیکھا۔ پاکستان کے قیام کے بعد میں ایک سال تک بہت پریشان رہا۔ اس دوران ایک تو مجھے خانگی حادثہ پیش آیا یعنی میری بیوی کا انتقال ہو گیا، اور دوسرے یرقان کا بڑا سخت حملہ ہوا۔

۱۹۵۰ء میں میری صحت قدرے بحال ہو گئی۔ اسی زمانے میں پیر صاحب مانکی شریف نے ہمارے ضلع کا دورہ کیا۔ اور ہمیں عوامی مسلم لیگ بننے کی دعوت دی۔ پشاور میں عوامی لیگ کا کنونشن ہوا۔ عبد القیوم خان کے دور وزارت میں سرحد میں سیاسی کام مشکل ہو گیا تھا۔ اور خود پیر صاحب مانکی شریف کی گرفتاری

کے امکانات بھی پیدا ہو گئے تھے۔ چنانچہ طے کیا گیا کہ پنجاب کے شہر کیمبل پور میں پارٹی کا ایک مرکز ہو۔ فضل حق شیدا، عبدالرزاق خاں بنوں، اور میں اس مرکز میں کام کرنے لگے۔ پنجاب کے سرکردہ سیاسی لوگوں سے بھی ہم نے ملاقاتیں کیں۔ اور ان کو سرحد کی مخدوش صورت حال سے آگاہ کیا۔ صوبہ سرحد کے مرد آہن عبدالقیوم خاں کی لاقانونیت اور استبداد کے خلاف پنجاب کے سیاسی حلقوں سے جو زبردست مہم شروع ہوئی، اس میں ہماری انہی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ ۱۹۵۱ء میں صوبہ سرحد کی اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ اور ان میں عبدالقیوم خاں کے حکم سے جو بدعنوانیاں کی گئیں ان کی ایک طویل داستان ہے۔ اس سلسلے میں ایک وفد پیر صاحب زکوڑی شریف کی سرکردگی میں کراچی روانہ ہوا، تاکہ مرکز کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرے۔ وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین سے ہم نے ملاقات کی۔ لیکن ہماری گذارشات پر انھوں نے کوئی توجہ نہ کی۔ سردار بہادر خاں مرکزی وزیر نے وفد سے ہمدردی کا اظہار کیا لیکن عملاً مدد کرنے میں اپنی بے بسی کا اعتراف کیا۔ ہم واپسی پر لاہور ٹھہرے اور پریس والوں کو صوبہ سرحد کے حالات سے مطلع کیا۔

اسی زمانے میں، میں نے آزاد پاکستان پارٹی کی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ اور ایک وقت آیا، جب مجھے پارٹی کی کنوینگ کمیٹی کا سیکرٹری چنا گیا۔ میں ۱۹۵۶ء تک پارٹی کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ ستمبر ۱۹۵۶ء میں آزاد پاکستان پارٹی کی کنوینگ کمیٹی نے دوسری جماعتوں سے مل کر ایک نئی پارٹی کی تشکیل کی جس کا نام پاکستان نیشنل پارٹی تجویز ہوا۔ اور

آزاد پاکستان پارٹی اس میں مدغم ہو گئی۔ نئی پارٹی کے لیے اور عہدے دار چنے گئے۔ لاہور سے میں اپنے گاؤں ملک پور چلا آیا۔ اور اب تک اسی میں مقیم ہوں۔

ملک پور۔ ۱۹۶۱ء

حواشی:

ص ۱۴ سطر ۱۔ مولوی غلام رسول صاحب بغوی: آپ بغہ ضلع ہزارہ کے رہنے والے تھے۔ منطق اور علم الکلام پر پورا عبور تھا۔ یہاں سے دیوبند گئے اور وہاں ان علوم کا درس دیتے رہے۔ تصوف میں بھی آپ خاص حیثیت کے مالک تھے۔ حضرت شیخ الہند سے آپ کو خاص تربیت حاصل ہوئی۔ آپ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کی اسیریٔ مالٹا کے ایام میں وفات پا گئے۔ حضرت شیخ الہند نے ان کی وفات پر مرثیہ لکھا جو کلیات شیخ الہند میں شائع ہو چکا ہے۔ اس سے آپ کے حضرت شیخ الہند سے تعلق اور ان کے ہاں آپ کے مرتبہ کا پتہ چلتا ہے۔

ص ۱۵ سطر ۲۔ دادا امیر حیدر: آپ کہوٹہ تحصیل کے ایک گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ متحدہ ہندوستان میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کے ماتحت کام کرتے رہے۔ آپ ہندوستان میں اشتراکی تحریک کے بانیوں میں سے ہیں۔ جنوبی ہند میں اشتراکیت کی تنظیم اور ترقی آپ کی خاص طور پر رہین منت ہے۔ وہاں کی تحریک کے آج کل کے اکثر قائد دادا حیدر کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ یا آپ کے تربیت یافتہ اشخاص کے

تربیت یافتہ ہیں۔ آپ اشتراکی دنیا میں ایک خاص حیثیت کے مالک ہیں اور عملی طور پر مختلف ممالک میں انقلاب کا عملی مشاہدہ اور تجربہ رکھتے ہیں۔ ان دنوں آپ راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ میں نے علمی طور پر ان سے بہت سیکھا ہے۔

ص ۹۵ ۳۔ مولوی محمود احمد صاحب: ہمارے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نے خود اپنی محنت سے زراعت اور تجارت کے ذریعہ گاؤں میں اچھی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ پرائمری پاس کرنے کے بعد انھوں نے علاقہ ہی میں دینی تعلیم کا حصول کیا۔ پھر دیوبند چلے گئے۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو واپس آکر بدعات اور رسوم کے خلاف جدوجہد شروع کی۔ خاموش طبیعت کے تھے۔ مولوی صاحب اصلاح رسوم کا مسلسل کام کرتے رہے اور اس علاقہ میں بری رسوم کی کمی ایک حد تک ان ہی کی بدولت ہوئی۔ علمائے سوء نے ان کی بہت مخالفت کی۔ کئی بار اپنے طلبہ سے ان پر حملہ کرانے کی بھی کوشش کی۔ آپ نے انجمن اصلاح الرسوم ہزارہ میں کافی کام کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ پنجاب میں لائل پور اور منٹگمری وغیرہ کے اضلاع میں بھی آپ نے تبلیغ کا کام کیا اور کئی غیر مسلم ان کی کوشش سے مشرف باسلام ہوئے۔

ص ۹۶ ۴۔ مولوی قمر علی صاحب: آپ گھنول وادی کاغان کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ کی درس گاہ فرنگی محل کے فارغ التحصیل تھے۔ دل میں جہاد کا زبردست جذبہ تھا۔ انگریزی سامراج کے کٹر مخالفوں میں سے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں کانگریس میں شریک ہوئے۔ جب مقامی مولویوں نے سرخ رنگ کو خلاف شرع کہا تو آپ نے جواز کا فتویٰ دیا اور خود ایک سرخ رنگ کا جبہ پہن کر سرخ پوش جماعت میں شریک ہو گئے۔ آپ کو گرفتار کر کے ایبٹ آباد جیل میں بھیجا گیا۔ وہاں جب سرخ پوشوں نے نعرے لگائے

تو سب کو ایک ایک درجن بیدوں کی سزا دی گئی۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ میجر جیز اگھاٹ نے، جو ایک پارسی تھا، اپنے سامنے ان لوگوں کو بید لگوائے۔ اس پر مولانا نے کہا کہ شرعاً پاجامہ اتار کر جسم کے عورت حصہ پر بید زنی ناجائز ہے اور انھوں نے پاجامہ اتارنے سے انکار کر دیا۔ اس پر زبردستی مولانا کا پاجامہ اتروایا گیا اور انھیں بید لگوائے گئے۔ چوتڑوں پر بید لگائے گئے جن سے زخم ہو گئے۔ مولانا نے ہسپتال میں علاج کرنے سے انکار کر دیا۔ زخم خراب ہو گئے جن کی وجہ سے لمبے عرصہ تک مولانا صاحب فراش رہے اور خود مرہم پٹی کرتے رہے۔ رہائی کے بعد بھی زخم مندمل نہ ہوئے اور کافی عرصہ انھوں نے تکلیف اٹھائی۔ جب زخم ٹھیک ہوئے تو مولانا نے پھر سیاسی کام شروع کر دیا۔ ایک پاؤں سے مولانا قدرے لنگڑے تھے، پھر بھی وہ علاقہ میں دورے کرتے رہے۔ ۱۹۴۲ء میں مولانا دوبارہ گرفتار ہوئے۔ چھ ماہ کی سزا ہوئی۔ اور پھر ایبٹ آباد جیل بھیجے گئے، جہاں انھوں نے بھوک ہڑتال کر دی اور انھیں ہری پور جیل منتقل کر دیا گیا۔ قید کے دوران قیدیوں سے جو ناروا سلوک ہوا اس سے مولانا بہت خفا تھے۔ چنانچہ رہا ہو کر ہجرت کر کے علاقہ غیر چلے گئے۔ وہاں حاجی صاحب ترنگزئی کے ہمراہ مسلح جہاد میں شریک ہو گئے۔ ایک محاربہ میں آپ کو گولی لگی اور افغانستان کے ایک ہسپتال میں داخل ہو گئے۔ لیکن جانبر نہ ہو سکے اور انتقال کر گئے۔

ص ۱۰۵ سوامی سیوا انند: بمبئی کانگریس کمیٹی کے رکن تھے۔ انھوں نے گاندھی جی کی تحریک میں بہت کام کیا۔ حکومت بمبئی نے ان کو گرفتار کرنا چاہا۔ لیکن وہ روپوش ہو کر کام کرتے رہے اور جب بارڈولی تحریک ختم ہو گئی تو انھیں مفرور قرار دیا گیا۔ بمبئی سے وہ سادھوؤں کے لباس میں نکل کر نینگیاری میں آکر آباد ہو گئے، اور ایک پہاڑی نالہ پر مکان تعمیر

گستے رہنے لگے۔ جب شکیارتی میں کانگریس کا زور ہوا تو وہ سیاسی لوگوں کو مشورہ دیتے رہتے۔ وہ اشتراکی خیال رکھتے تھے۔ انھوں نے ہماری کسان تحریک کی بڑی مدد کی۔ سوامی صاحب نے "تذکرۃ الاولیا" کتاب کا انگریزی سے گجراتی زبان میں ترجمہ کیا۔ دیگر کئی مذہبی کتب کے بھی انھوں نے تراجم کیے۔ ہندو لٹریچر کے سمجھنے اور ان کے تراجم مہیا کرنے میں انھوں نے میری بہت مدد کی۔ نیز ہندو فلاسفی اور بدھ فلاسفی وغیرہ کی کتابیں مجھے پڑھنے کے لیے دیں۔

مانسہرہ: تحصیل مانسہرہ کا صدر مقام ہے۔ یہاں ہندو ساری تجارتی منڈی پر قابض تھے۔ اور قیام پاکستان سے قبل وہ بڑے بااثر تھے۔ جس دن مسلم لیگ نے حکام مانسہرہ سے مل کر فساد کرایا جمعہ کا دن تھا۔ نماز جمعہ کے فوراً بعد ایک مندر میں دیہاتیوں نے آگ لگا دی۔ یہ بہار و ہندوستان کے فسادات کے بعد کا واقعہ ہے۔ بس آن کی آن میں بازار بند ہو گیا۔ میں موٹر یونین مانسہرہ کے دفتر سے نکل کر بازار کی طرف گیا۔ پل مانسہرہ پر میری ملاقات ارباب محمد عباس خاں صاحب مرحوم اے سی مانسہرہ سے ہوئی۔ میں نے انھیں فساد پر قابو پانے کے لیے کہا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ پولیس کی موجودہ قوت بہت کم ہے اور وہ اس کے ساتھ قابو نہیں پا سکتے۔ البتہ کوشش کریں گے کہ انسانی جان کا اتلاف نہ ہو۔ وہ شہر میں لوٹ مار کی روک تھام کے لیے صدر مقام سے فوج اور پولیس کی امداد طلب کر چکے ہیں لیکن ابھی تک امداد نہیں آئی۔ میں نے ان سے عہد لیا کہ وہ اتلاف جان پر قابو پانے اور لوٹ مار جہاں تک کہ ممکن ہے روکنے کی کوشش کریں گے۔ اسی طرح رحمت اللہ خاں ایس۔ ایچ۔ او سے بھی میں نے یہ درخواست کی۔ انھوں نے بھی مجھے تعاون کا یقین دلایا۔ میں اور چند خاکسار دوست جنھیں میں اس امر کا قائل کر سکا کہ یہ فساد اچھا نہیں، ہندوؤں کو محفوظ مقامات تک پہنچانے میں مشغول ہو گئے۔ چند ہندو جو آگ میں گھر چکے تھے ان کے مکان پر ہم پہنچے۔ آگ نے تین طرف سے ان کے مکان کو گھیر لیا تھا۔

ہم نے ان سے دروازہ کھولنے کے لیے کہا۔ انھوں نے دروازہ نہ کھو[illegible]
کی دھمکی دی تو ایک خوبصورت، نوجوان ہندو لڑکی کو گھ[illegible]
نے دروازہ کھولنے کے ساتھ ہی ہمیں کہا کہ ہمارے [illegible]
[illegible] نے کہا کہ ہم ان کو [illegible]
[illegible]
[illegible] کا اپنا کام ہے۔ ہم نے ان کو [illegible] حفاظت [illegible] کے لیے [illegible]
[illegible] نے سیڑھی لگا کر مشکل سے [illegible] دروازوں کو ہم نے کہا کہ وہ بعد میں [illegible]
ہم نے ان کو مکان سے نکال کر محفوظ مقام تک پہنچایا۔ غرضیکہ شام تک ہم اسی کام میں لگے رہے
بازار تمام کا تمام آگ کی نذر ہو گیا۔ شام کو کرفیو لگا دیا گیا اور فوج نے چارج لے لیا۔ میں شام
کو موٹر میں بیٹھ کر گھر پہنچا۔ ساری رات مانسہرہ کا خوبصورت شہر جلتا رہا، اور فوج آگ پر
قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ ابتدائی رپورٹ میں میرا نام بطور گواہ کے درج کیا گیا۔
میں نے شہادت دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اس حکومت کے کارندوں کے سامنے
گواہی نہیں دوں گا جو انسانی جان و مال کی حفاظت نہیں کر سکی۔ بعد میں میجر کرٹس نے
تحقیقات کی۔

[illegible] ۱۹۱۱ء

[illegible]

اشتراکی عالمِ ربانی

مولانا عبدالرحیم پوپلزئیؒ

عمر فاروق خاں

سندھ ساگر اکادمی لاہور
چوک مینار - انارکلی

